ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

ہندامریکہ تعلقات [illegible] پیش رفت

Annual Subscription

	Surface Mail	Air Mail
[illegible]	[illegible]	[illegible]
Nepal	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

منشی پریم چند کے 125ویں یوم ولادت کے موقعے پر قومی اردو کونسل نے کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین، اتر پردیش اردو اکادمی اور جدید مرکز، لکھنؤ کے اشتراک سے 31/جولائی تا 2/اگست 2005 سہ روزہ مذاکرہ بعنوان "اردو ادب وتہذیب کے ارتقا میں پریم چند اور ان کے معاصرین کی خدمات" منعقد کیا جس کا افتتاح گنا کسان سنستھان، لکھنؤ کے آڈیٹوریم میں اتر پردیش کانگریس کے صدر جناب سلمان خورشید اور مشہور فلم اداکار جناب فاروق شیخ نے کیا۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں (دائیں سے) جناب سلمان خورشید، جناب کامتا ناتھ، جناب فاروق شیخ، محترمہ ویلا بنرجی (جوائنٹ سکریٹری۔ لینگویجز، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند) اور
جناب ظفر علی نقوی چیئرمین اسٹینڈنگ کمیٹی آف نیشنل مانیٹرنگ کمیٹی فار مائنارٹیز ایجوکیشن۔

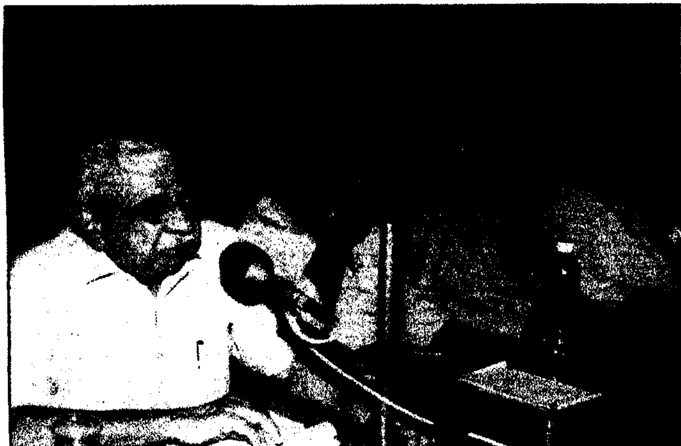

مذاکرے میں اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی۔ ساتھ میں پروفیسر قمر رئیس، جناب مدن گوپال (مرتب: کلیات پریم چند) اور ڈاکٹر علی جاوید۔

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد-7، شمارہ-9 ستمبر 2005

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاون مدیر: فیروز عالم

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر، قومی اردو کونسل

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

چیک یا ڈرافٹ NCPUL کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی - 110 066
فون: 26103381, 26103938
26179657 فیکس: 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066
فون:26109746

شاخ: 22-7-110 فخر الدین، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... خطوط 2
ہماری بات .... اداریہ 5
● کرشن کمار سے گفتگو .... مانش پریتم گوہین 7
● کمپیوٹر اور اردو .... اعجاز عبید 9
● اردو نصاب کی ترتیب میں ترجمہ اور ابلاغیات .... محمد ظفر الدین 13
● اردو زبان اور نئی نسل .... مولا بخش 15
● چاند— بعض نئے حقائق .... سنجے ورما دے 18
● بابا آمٹے— ایک مثالی شخصیت .... غلام نبی مومن 20
● وہٹ کا غلط استعمال .... بھرت جمن جمن والا 23
● قومی اردو کونسل کی کارکردگیاں .... عبدالرزاق 28
● شیروں کی کم ہوتی تعداد .... محمد خلیل 29
اتہاس کے جھروکے سے:
● وجے نگر سلطنت .... مدن گوپال 31
گوشۂ ادب:
● احمد جمال پاشا (خاکہ) .... عابد سہیل 34
گوشۂ فروغ کتب
● نظم کیا ہے؟ (''تنقیدی افکار'' سے اقتباس) .... شمس الرحمن فاروقی 39
● داستان گوئی (''اردو کی نثری داستانیں'' سے اقتباس) .... گیان چند جین 47
طلبہ کے لیے
● انٹرنیٹ پر روزگار کے بارے میں جانکاری .... گورو کمار 52
● سلائڈ شو کا سیٹ اپ اور اسے چلانا .... امت جین 54
● اردو زبان و ادب (کوئز) .... محمد فیروز 58
● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-26) .... انعام الحق 61
اردو خبرنامہ .... ادارہ 62
تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 72
● اردو کی نثری داستانیں/گیان چند جین .... مبصر: شہاب ظفر اعظمی
● عوامی ذرائع ترسیل اور تعمیر و ترقی/دیویندر اسّر .... مبصر: مشتاق صدف
● آؤ سمندر کی سیر کریں/محمد شمس الحق .... مبصر: مہتاب جہاں
● وش منتھن/غضنفر .... مبصر: فیروز عالم
● احتساب: انور شیخ کی غزل کا تنقیدی و تقابلی مطالعہ/عشرت ظفر .... مبصر: ارشد علی خاں
بچوں کا گوشہ
● کانچ بنانے کا فن (''سائنس کی کہانیاں'' (حصہ اول) سے اقتباس) .... سکنف اور سکنف 75

آپ کی بات

■ **سیف الدین سوز، ممبر پارلیمنٹ، اے. بی. 92 شاہ جہاں روڈ، نئی دہلی**

ڈاکٹر رفیق زکریا کی وفات سے مجھے دلی صدمہ ہوا۔ اسلام اور جدیدیت پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پر ہونا مشکل ہے۔ مختلف شعبہ ہائے حیات میں انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں، خاص طور سے ریاستی اور قومی سطح پر ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ عمر کی آخری منزل میں وہ اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ مسلمانوں کو عصر حاضر میں کس طرح مزید وسیع النظر اور وسیع الذہن بنایا جاسکتا ہے۔

■ **یوسف ناظم، 19 الہلال، 13 باندرہ ریکلیمیشن، ممبئی-400050**

''اردو دنیا'' کے جون کے شمارے میں ابوذر ہاشم صاحب کا مضمون ''کبیر بانی کا فکری پس منظر'' شائع ہوا تھا۔ میں اس سلسلے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

صوفی شاعر کبیر سے خاکسار کی قلبی اور ذہنی وابستگی کا اصل سبب، وہ کتاب ہے جو 1990 میں ''کبیر بانی'' کے نام سے ہندوستانی بک ٹرسٹ (ممبئی) کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ اس کے مصنف مرحوم علی سردار جعفری تھے۔ کبیر کی عارفانہ اور صوفیانہ شاعری سے متاثر ہوکر میں نے ان کی شاعری کا منظوم ترجمہ کرنے کی جسارت بھی کی۔

ابوذر ہاشم صاحب کے مضمون میں استعجاب کی بات میرے لیے یہ ہے کہ مضمون نگار نے یہ لکھا ہے کہ کبیر کے کلام کا اصل مسودہ فارسی رسم الخط میں تھا۔ انھیں اس انکشاف کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اردو والے مصر ہیں کہ کبیر اردو زبان کے شاعر ہیں (دیکھیے مضمون کا پہلا صفحہ، سطر نمبر-15)۔ کبیر کے کلام کے فارسی رسم الخط میں ہونے کی بات ظاہر ہے تحقیق سے ثابت ہوئی ہوگی اور یہ مسودہ غالباً اب نایاب ہوگا ورنہ فاضل مضمون نگار اس انکشاف کو مسکت بنانے کی غرض سے اس کا اتا پتا ضرور دیتے۔

زیر نظر مضمون کے چند جملوں نے بھی مجھے چونکایا۔ کبیر کے ایک دوہے کے ذکر کے بعد مضمون نگار نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ''اس دوہے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کبیر اذان کی اصلیت سے واقف نہیں۔ اسلام سے کماحقہ، واقفیت کی کمی بھی بعض دوہوں سے ظاہر ہوتی ہے مثلاً وہ قربانی پر معترض ہیں اور کہتے ہیں:

گلا کاٹ کر بسمل کریں تے کافر بے بوجھ
اور ان کو کافر کہیں اپنا کفر نہ سوجھ

یہ شعر پڑھ کر مجھے انشاء اللہ خاں انشا کا وہ شعر یاد آ گیا جس میں وہ کہتے ہیں:

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

کیا اس شعر اور اس نوع کے متعدد اشعار پر یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ شاعر اسلام سے کماحقہ، واقف نہیں ہے۔ میر نے تو یہ تک کہا ہے کہ ''قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا'' تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ میر مرتد ہوگئے تھے؟ غالب کے اشعار کی مثالیں پیش کی جائیں تو ان جیسے لوگ انھیں خارج از اسلام کرنے میں قطعی نہیں ہچکچائیں گے۔ وہ تو جنت کو بھی دوزخ میں ڈال دینے کی بات کہہ چکے ہیں۔ خاکسار کی رائے میں کبیر کی شاعری کو اس نقطۂ نظر سے پڑھنا انفرادی عمل ہے، تدریسی نہیں ہے۔ یہی کبیر اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں ''اے سادھو! یہ پنڈت بہت مقدس ہیں اور اونچے خاندان کے ہیں اور سبھا میں ان کی بڑی مان دان ہے۔ ان سے سب لوگ علم اور عرفان حاصل کرتے ہیں اور مجھے یہ تماشا دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ لوگوں کا پاپ کاٹنے کے لیے یہ کتھا سناتے ہیں اور کام ان سے بہت نیچے کرواتے ہیں۔ میں نے دونوں کو ایک ساتھ ڈوبتے دیکھا ہے جس کو انھوں نے سہارا دیا اس کو لے ڈوبے۔'' (کبیر بانی مرتبہ علی سردار جعفری، ص-212)

کیا کبیر کی یہ نظم انھیں کافر ٹھہراتی ہے، نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ابوذر ہاشم صاحب لکھتے ہیں کہ کبیر کی بھگتی یا عشق اس لیے ہے کہ مکتی حاصل ہوجائے۔ وہ خدا کے عشق میں اس لیے جتلا نہیں ہوئے کہ اس سے جنت ملے گی بلکہ وہ کہتے ہیں:

جب تک ہے بیکنٹھ کی آسا
تب تک ہری چرن نواسا

(جب تک جنت کی امید ہے تب تک ہری کے قدموں کے نیچے نہیں رہ سکتے۔ کبیر مکتی چاہتے ہیں۔) (اردو دنیا، ص-9)

میں اپنے بکھرے بکھرے مطالعے کی بنا پر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ کبیر جیسا عظیم المرتبت اور انسان دوست شاعر، ہند نژاد نہ ہوتا تو ہندوستانی ادب کی اوقات کیا ہوتی۔ مضمون نگار نے اپنے مضمون کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے۔

''کبیر بانی جب مسلمانی سے مس کرتی ہے تو بھی ویدانت کے فلسفے آواگون، مکتی، نروان وغیرہ کے حصار میں ہوتی ہے اور جب مورتی پوجا، ذات پات، چھوا چھوت، اونچ نیچ اور شرادھ وغیرہ کی ملامت کرتی ہے تو بھی عقائد کے عجائب خانے اور رسومات کے انبوہ سے ہندو دھرم کو مکتی دلانے کا فرض انجام دیتی ہے اور اپنی قوت نمو بھی وہیں سے حاصل کرتی ہے۔'' اس تجزیے کے بارے میں کچھ کہے بغیر میں'' ہندوستانی ادب کی بیاض'' (An anthology of Urdu

(literature) کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس میں کبیر کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے کہ وہ مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور ذہنی وقلبی لحاظ سے ہندو تھے۔ بنارس میں بنکر کی حیثیت سے رہتے تھے اور اپنے گیتوں میں صوفیانہ خیالات کو نظم کرتے تھے اور یہ کہ انھوں نے اسلام اور ہندوئیت کی بنیادی تعلیمات کو فروعات سے دور رکھنے کی تلقین کی۔ ان کی نظموں میں اس عہد کی قدامت پسندی پر بیباکانہ تنقید ہے۔ مذکورہ کتاب کا سنہ اشاعت 1971 ہے۔ چند نظمیں دیکھیے

مجھ کو نہ ڈھونڈ اے مرے بندے یہاں وہاں
میں تو ہوں تیرے جسم میں موجود مثل جاں
مندر میں میں نہیں ہوں نہ مسجد میں میں کہیں
کعبے میں میں چھپا ہوں نہ کیلاش میں نہاں
مجھ کو جو صدق دل سے پکارے گا اے کبیر
پائے گا مجھ کو اپنی ہی سانسوں کے درمیاں

(کبیر بانی، ص-66)

باغوں میں گھومنے سے ہے کیا فائدہ میاں
خود تیری ذات میں ہے چھپا ایک گلستاں
دل کے کنول میں تیرے دریچے ہزار ہیں
ان ہی سے دیکھ جلوۂ حق کا حسیں سماں

(کبیر بانی، ص-70)

کبیر نے خالق سے اپنے رشتے کو شوہر اور زوجہ کا رشتہ کہا ہے۔ یہ چند شعر اس کا ثبوت ہیں۔

دن رات میں سکھیوں ہی کی سنگت میں مگن تھی
اب دل میں مرے خوف ہے میں سوچ رہی ہوں
صاحب تو مرے اونچی اٹریا میں رہت ہیں
میں کیسے بلندی پہ چڑھوں کانپ رہی ہوں
اس لاج کے پردے سے نکلنا ہی پڑے گا
محبوب سے ملنا ہے تو چلنا ہی پڑے گا
میں ان سے ملوں گی تو الگ ہو نہ سکوں گی
گھونگھٹ جو اٹھاؤں گی تو پھر سو نہ سکوں گی
میں آرتی آنکھوں سے اتاروں گی سجن کی
سدھ مجھ کو رہے گی مرے تن کی نہ بدن کی

(کبیر بانی، ص-86)

میں ابوذر ہاشم صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے مضمون سے کبیر کی یاد تازہ کردی۔

■ محمد احمد سبزواری، 1174، پی آئی. بی کالونی، کراچی، (پاکستان)

''اردو دنیا'' کا مارچ 2005 کا شمارہ دیکھا۔ اس کے مطالعے سے مجھے پتہ چلا کہ ہندوستان میں اردو پر کافی کام ہو رہا ہے۔ آپ کے مجلے کی نوعیت ڈائجسٹ سے ملتی جلتی ہے کہ آپ دوسرے رسالوں سے بھی قیمتی مضامین کا انتخاب کرتے ہیں۔ پھر آپ نے گوشوں کا تعین کیا ہے جو ایک جدت ہے، نیز آپ نے رسالے کو ادب یا ادبیات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کو زندگی کے جدید معمولات سے منسلک کر دیا ہے۔ ''پٹرول کو الوداع''، ''سمندری لہروں سے توانائی کی فراہمی''، ''خوف ناک سمندری لہریں'' اور دوسرے مضامین اس کی نمایاں مثال ہیں۔ دراصل اردو کو زندہ رکھنے اور فروغ دینے کے لیے اس کا دامن جدید تکنیکی اور سائنسی موضوعات سے پُر کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس شیریں ترین زبان سے متعارف کرانا ہوگا۔ آپ کے رسالے کے جملہ مشمولات وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔

محترم سرور عالم راز نے رومن اردو کا جامع نظام کافی محنت سے تیار کیا ہے۔ پاکستان میں بھی اردو کو ویب سائٹ پر لانے، کمپیوٹرائزڈ کرنے کے سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان اور Centre for Research in Urdu Language Processing, National University of Computer and Emerging Sciences میں بڑا کام ہو رہا ہے۔ اسی کے ساتھ اردو املا کے بعض مسائل، قواعد اور حروف کی ساخت پر بھی بحث ومباحثہ کا سلسلہ جاری ہے لیکن میں یہ باور کرتا ہوں کہ اس قسم کی باریکیاں زبان کے اساتذہ اور محققین کے لیے تو ضرور مفید ہوں گی مگر معمولی پڑھے لکھے اور بالخصوص نوآموزوں کے لیے تو بھول بھلیاں ثابت ہوں گی اور کہیں وہ ان ضابطوں اور قاعدوں سے بددل ہو کر اپنا راستہ ہی نہ بدل دیں۔ میں آپ کی مطبوعات کی کم قیمتوں سے بھی متاثر ہوا۔

■ مشتاق صدف، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

''اردو دنیا'' کا مطالعہ اب ناگزیر ہو گیا ہے۔ اس میں شامل مشمولات سے اس کی انفرادیت اور مقبولیت کا اندازہ ہر ذی فہم شخص کر سکتا ہے۔ ''اردو دنیا'' صوری اور معنوی دونوں ہی اعتبار سے بالکل منفرد ہے۔ دوسری زبانوں سے معیاری مضامین کا ترجمہ شائع کرنا ''اردو دنیا'' کی انفرادیت ہے۔ یہ کام اردو کے معدودے چند رسائل کر رہے ہیں۔ جولائی کے شمارے میں ایسے مضامین شامل ہیں جن کی قدر و قیمت سے انکار ممکن نہیں۔ رحمت یوسف زئی کا مضمون ''کمپیوٹر اور خطاطی'' اور محمد عارف اقبال کا مضمون ''اردو کی بقا کے لیے چند عملی تجاویز'' بے حد معلوماتی ہیں۔ سائنسی صحافت پر اسعد فیصل فاروقی نے کچھ اہم نکات کی جانب اشارے کیے ہیں۔ عبیدالرحمٰن کا مضمون ''دو صدیوں کا نقاش۔ البرٹ آئنسٹائن'' بے حد معلوماتی ہے۔ اردو کمپیوٹر کی تعلیم اور پروفیشنل کورسوں سے متعلق قومی کونسل کی خدمات بھی گراں قدر ہیں۔

■ محمد ہاشم قدوائی، سابق ممبر راجیہ سبھا، روز ڈاپارٹمنٹس، میورو ہار، نئی دہلی

''اردو دنیا'' کے شمارے برابر موصول ہوتے رہتے ہیں اور اس کے معلوماتی مضامین سے استفادہ کرتا رہتا ہوں۔ ''ادبی کوئز'' کا سلسلہ بہت مفید ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس میں اردو کے عظیم المرتبت اور جلیل القدر ادیبوں اور استاد شاعروں کو بھی جگہ دی جائے مثلاً علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، اکبر الہٰ آبادی، ریاض خیرآبادی، جگر مرادآبادی وغیرہ۔ ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں کے اقتباسات بھی اگر ''اردو دنیا'' میں شائع ہوتے رہیں تو بہت اچھا ہوگا۔ اسی طرح ملک کی جنگ آزادی کے بارے میں مضامین شائع کیے جائیں تو بہت بہتر ہو۔

■ سکھدیو شرما رشک، فتح گڑھ چوڑیاں، ضلع گورداسپور، (پنجاب)

''اردو دنیا'' ہر ماہ باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ اس وقت اگست کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ اس کی صحت و خوبصورتی کسی تعریف یا توصیف کی محتاج نہیں۔ معیاری رسائل میں یہ ایک نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ زیر نظر شمارے میں یوں تو ہر مضمون پر مغز اور جاندار ہے تاہم نسیب الرحمان کی نظم ''یہ گھر'' بہت پسند آئی۔

فتح گڑھ چوڑیاں ہندو پاک سرحد سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک غیر معروف قصبہ ہے جس میں اردو جاننے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے۔ چونکہ ''اردو دنیا'' واحد رسالہ ہے جو میرے پاس پہنچتا ہے اس لیے شائقین اردو اکثر اس سے مستفید ہوتے ہیں اور وہ اس خط کے توسط سے ادارہ ''اردو دنیا'' کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

■ کے سی عطاء اللہ خاں سنجری، شعبۂ اردو، شری شنکراچاریہ یونیورسٹی آف سنسکرت، کالی کٹ، کیرالا

ماہنامہ ''اردو دنیا'' جولائی کے شمارے میں کے. پی. شمس الدین نے ''کیرالا میں اردو'' میں عرق ریزی سے مضمون کی کڑیاں یکجا کرنے کی سعی کی ہے۔ موصوف کی کوشش قابل ستائش ہے۔ مذکورہ مضمون کے ذریعے چند نئی باتیں راقم کے علم میں بھی آئیں لیکن چند امور ایسے بھی ہیں جن کی جانب مضمون نگار نے توجہ نہیں دی ہے۔ مثلاً کیرالا کی جامعہ شری شنکراچاریہ (سنسکرت)، علاقائی مرکز، کوئی لانڈی، کالی کٹ میں نہ صرف ایم اے اردو کا انتظام ہے بلکہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی بھی سہولتیں مہیا ہیں۔ اس شعبے سے فارغ التحصیل پانچ طلبہ نے تا حال یو جی سی کے ذریعے منعقدہ قومی اہلیتی جانچ (NET) میں کامیابی حاصل کی ہے اور سات مقامی اساتذۂ اردو نے جامعہ شری شنکراچاریہ (سنسکرت) کے علاوہ ملک کی مختلف جامعات سے ڈاکٹریٹ کی اسناد بھی حاصل کی ہیں اور درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کیے گئے مقالہ جات میں دو مقالے ایسے بھی ہیں جو کیرالا میں اردو کی صورت حال کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ مقالے SCERT کے سابق اردو ریسرچ آفیسر عبدالغفور اور ای. محمد، صدر، شعبۂ اردو، برنن کالج، تلی چری (جہاں اردو بطور دوسری زبان اور بطور زبان اول بی اے میں پڑھائی جاتی ہے) نے لکھے تھے۔ کم از کم مذکورہ مقالوں کا ذکر نا گزیر تھا۔

■ محمد فیروز اختر، 115، چندر بھاگا ہاسٹل، جے. این. یو. نئی دہلی-110067

''اردو دنیا'' جون کا شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ محمد سعد الحسن خاں سے ایک ملاقات پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ اس کے مطالعے سے طالب علموں کی حوصلہ افزائی ہوگی اور وہ صحیح سمت میں آگے بڑھ سکیں گے۔ ''ہماری بات'' کے تحت ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام کی زندگی کے نشیب و فراز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ صدر جمہوریہ کے حالات زندگی سے ہم نوجوانوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔ انھوں نے غربت و افلاس کا مقابلہ کیا اور زندگی کے ہر موڑ پر ثابت قدم رہے، اور آخر کار انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔

اپریل کے شمارے میں غلام نبی مومن کا مضمون ''نصاب تعلیم اور قومی یکجہتی'' بہت پسند آیا۔ بچوں کی تربیت سے متعلق انھوں نے بہت کام کی باتیں لکھی ہیں۔ بچپن ہی سے بچوں کو دوسروں سے متعارف کرنا چاہیے اور صبر و تحمل، رواداری، عزت و احترام نیز دوسروں پر اعتماد کرنا سکھانا چاہیے تاکہ دوسروں کے تئیں ان کے رویے میں مثبت تبدیلی آسکے۔

■ وسیم بیگم، ای-141، اسٹریٹ-21، ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی-110025

اگست کے ''اردو دنیا'' میں پروفیسر اے. ایم. پٹھان نے گیسٹ کالم کے تحت اردو صحافت کا معروضی تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے جو مشورے دیے ہیں وہ اردو صحافت کی ترویج و ترقی میں معاون ثابت ہوں گے۔ مگر ان کو آج کے بدلتے ہوئے منظرنامے کے مطابق عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے۔

ایم. اے. قریشی کا مضمون ''سائنس، ٹیکنالوجی اور سماج'' ایک معلوماتی مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے سائنس، ٹیکنالوجی اور سماج کے آپسی رشتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اگر ہم سماج میں مساوات اور بھائی چارہ چاہتے ہیں اور ایک ترقی یافتہ سماج تشکیل دینا چاہتے ہیں تو سائنس اور ٹیکنالوجی سے وابستگی لازمی ہے۔

■ شجاع الدین شاہد، 75/599، ایم ایچ بی کالونی، گیٹ نمبر-8، ملاڈ ویسٹ، ممبئی-95

''اردو دنیا'' پابندی سے موصول ہو رہا ہے۔ ہر شمارہ پوری اردو دنیا کو سمیٹ لیتا ہے۔ آپ حضرات جس قدر محنت اور لگن کے ساتھ اردو کی ترویج و ترقی کا کام انجام دے رہے ہیں، اس کی مثال نہیں ملتی۔ بیشتر مشمولات اور مختلف مستقل کالموں کی انفرادیت دیکھ کر آپ کی وسیع النظری اور جاں فشانی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ جولائی کے شمارے میں محترم سید حامد کا مضمون ''وزیر اعظم کی اعلیٰ سطح کمیٹی'' پڑھ کر اطمینان کا احساس ہوا۔ خدا کرے کہ یہ سرکاری اعلامیہ پایۂ تکمیل کو پہنچے۔

ہماری بات

وزیر اعظم ہند ڈاکٹر منوہن سنگھ کا تین روزہ امریکی دورہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ہندوستان پہلی بار یہ بات تسلیم کرانے میں کامیاب ہوا ہے کہ ہندوستان ایک ایسا مضبوط جمہوری ملک ہے جس نے اپنی تہذیب اور اقدار کے دائرے میں رہ کر آزاد اور غیر جانبدارانہ انتخابی نظام، خود مختار الیکشن کمیشن، غیر جانبدار عدلیہ، آزاد پریس، پیشہ ور فوج، بہتر شہری نظم ونسق، قانون کی بالادستی اور حقوق انسانی کے تحفظ کے ذریعے جمہوری معاشرے کی بنیاد ڈالی اور اسے پروان چڑھایا ہے۔ ہندوستان کا معاشی نظام اور اس کی معیشت مسلسل ترقی کی جانب گامزن ہے۔ ہندوستانی معیشت کی ترقی سے نہ صرف امریکہ کو فائدہ پہنچے گا بلکہ ہندوستان کے ہمسایہ ممالک بھی اس سے مستفید ہوں گے۔ ڈاکٹر منوہن سنگھ نے باوقار انداز میں ہندوستان کے موقف اور اس کے مفادات کی ترجمانی کی۔ انھوں نے نہ تو امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کی منہ بھرائی کی اور نہ ہی ان کو خوش کرنے کے لیے ان کی پالیسیوں کی جن سے ہندوستانی نظریات میل نہیں کھاتے، تعریف کی۔ انھوں نے بے حد سلجھے ہوئے انداز میں ہندوستانی عوام کے احساسات اور خواہشات کی نمائندگی سنجیدگی اور خود اعتمادی کے ساتھ کی۔

اس دورے میں امریکی حکومت نے پہلی بار ہندوستان کو ایک ذمے دار جوہری طاقت رکھنے والا ملک تسلیم کیا جس نے کسی بھی ملک کے خلاف جوہری ہتھیاروں کے استعمال میں پہل نہ کرنے کا بین الاقوامی وعدہ کیا ہے۔ امریکہ نے تاراپور جوہری توانائی پلانٹ کو جو امریکہ کے تعاون سے ہی تیار ہوا ہے، ایندھن کی فراہمی کا وعدہ بھی کیا ہے۔ بش انتظامیہ نے نہ صرف تاراپور جوہری توانائی پلانٹ کو یورینیم فراہم کرانے کا وعدہ کیا ہے بلکہ قومی جوہری توانائی پروگرام کے تحت کام کرنے والے دیگر ری ایکٹروں (Reactors) کو بھی قدرتی یورینیم مہیا کرانے کی ہامی بھری ہے۔ یہ ہندوستان کی ایک بڑی کامیابی ہے۔ 1975 میں پوکھرن میں ہندوستان کے نیوکلیائی تجربے کے بعد امریکہ نے ایندھن کی فراہمی بند کردی تھی۔ 1998 میں پوکھرن-2 نیوکلیائی تجربے کے بعد امریکہ نے کئی دیگر پابندیاں بھی عائد کردی تھیں۔ اب ان تمام پابندیوں کے اٹھالیے جانے کا بھی امکان ہے۔ ڈاکٹر منوہن سنگھ نے امریکہ کو باور کرایا کہ ہندوستان کے نیوکلیائی پروگرام کا مقصد اپنی غیر فوجی ضروریات کی تکمیل ہے، اس کا کوئی فوجی مقصد نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ نیوکلیائی عدم توسیع کے معاملے میں ہندوستان کا ریکارڈ صاف ہے اور وہ مستقبل میں بھی ایک ذمے دار نیوکلیائی طاقت بنا رہے گا۔

امریکی کانگریس کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اعظم ہند نے کئی اہم امور پر ہندوستان کا موقف واضح کیا۔ ڈاکٹر منوہن سنگھ نے ہندوستانی قوم کی حب الوطنی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی تعمیر وترقی میں تمام ہندوستانیوں نے یکساں کردار ادا کیا ہے اور وطن سے محبت ہمارا قیمتی ورثہ ہے۔ دہشت گردی کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس سے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہندوستان اور سب سے قدیم جمہوریت امریکہ دونوں کو یکساں خطرہ درپیش ہے۔ دہشت گردی جمہوریت کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے اور اس کے تئیں کسی بھی طرح کی نرمی نہیں برتی جانی چاہیے۔ اس کے خلاف مشترکہ جدوجہد کو مزید تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ اقوام متحدہ میں اصلاحات کے سلسلے میں انھوں نے کہا کہ اس عالمی ادارے کو مزید موثر اور نمائندہ بنانے کے لیے کچھ اقدامات ناگزیر ہیں۔ انھوں نے اس ضرورت پر بھی زور دیا کہ ایک ایسا عالمی نظام قائم کیا جائے جس میں تمام ترقی پذیر جمہوری ممالک وسیع تر خوش حالی کی جدوجہد میں کامیابی سے ہمکنار ہوسکیں۔ انھوں نے اپنے خطبے میں مزید کہا کہ ہندوستان اور امریکہ دونوں جمہوری ممالک کئی لحاظ سے فطری طور پر شراکت دار ہیں۔ اس طرح ہم ایک ایسے موڑ پر کھڑے ہیں جہاں سے ہم اصولی اور حقیقت پسندانہ شراکت داری کا آغاز کرسکتے ہیں۔ اس موقعے پر جاری مشترکہ بیان کی خاص باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

1. ہندوستان کو نیوکلیائی ٹیکنالوجی کے حامل ایک ذمے دار ملک کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ کچھ ہندوستانی نیوکلیائی اداروں پر عائد پابندیاں ختم کی جائیں گی۔
2. عالمی دہشت گردی کے خلاف مہم کو مشترکہ کاز کے طور پر تسلیم کیا جائے گا۔
3. دونوں ملکوں کے مابین اقتصادی امور پر مذاکرات کا دور پھر شروع ہوگا، نجی شعبے میں توانائی کے فروغ کے لیے سی۔ای۔او فورم قائم کیا جائے گا۔
4. زراعت کے شعبے میں تحقیق، خدمات اور زرعی اجناس کی تجارت میں اضافے کے لیے معلومات کے تبادلے کا نظام قائم کیا جائے گا۔
5. نیوکلیائی توانائی سمیت ہندوستان میں مستقل اور معتبر توانائی ذرائع کو فروغ دیا جائے گا۔
6. ہند امریکہ دفاعی تعلقات کے لیے نیا خاکہ تیار کرنے پر اطمینان کا اظہار کیا گیا۔
7. عالمی سطح پر ایچ.آئی.وی. (ایڈس) کے تدارک کے لیے تعاون مضبوط کرنے کا عہد۔
8. دنیا میں جمہوریت کے فروغ کے لیے مل کر کام کرنے اور اقوام متحدہ کے

جمہوریت فنڈ میں زیادہ عطیہ دینے کا وعدہ۔

9. بین الاقوامی سطح پر بڑے پیمانے پر ہلاکت کے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے اہم کردار ادا کرنے پر رضامندی۔

10. سونامی جیسی قدرتی آفات کے پیش آنے پر راحتی کاموں میں پہل کرنے کا عہد۔

11. سائنس و ٹیکنالوجی سمجھوتے کے تحت ہند امریکہ اعلیٰ ٹیکنالوجی تعاون گروپ کے قیام پر اتفاق۔

12. خلائی تحقیق میں تعاون۔

13. ہندوستان اور امریکہ دنیا میں استحکام، جمہوریت، امن اور خوشحالی کے فروغ کے لیے کام کریں گے۔

14. ہندوستان اپنے فوجی، غیر فوجی نیوکلیائی پروگراموں اور پالیسیوں کی اطلاع بین الاقوامی نیوکلیائی توانائی ایجنسی کو دے گا۔

15. امریکہ ہندوستان کے تارا پور نیوکلیائی کارخانے کو ایندھن مہیا کرانے پر غور کرے گا۔

ہندوستانی معیشت آج دنیا کی سب سے تیزی سے ترقی کرنے والی معیشتوں میں سے ایک ہے اور اس نے 8-7 فیصد سالانہ کی شرح سے ترقی کرنے کی صلاحیت بہم پہنچائی ہے۔ مختلف میدانوں میں حاصل ہونے والی کامیابیاں ہمارے اندر یہ اعتماد پیدا کرتی ہیں کہ اب ہم اور زیادہ حوصلہ مندانہ قدم اٹھائیں اور ملک کی معاشی ترقی کی رفتار مزید تیز کریں۔

ہمارے پاس تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ نوجوان ہیں جو مختلف شعبوں میں ماہرانہ صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ یہ نوجوان ان دو اہم طاقتوں کے درمیان اشتراک کی بنیاد بن سکتے ہیں اور اس سے ہند امریکہ تعلقات کو ایک نئی جہت مل سکتی ہے۔

وزیر اعظم کے اس دورے سے ہند امریکہ رشتوں میں انقلابی تبدیلی آنے کے آثار ہیں نیز جو امکانات اور مفاہمتیں بات چیت سے ابھری ہیں وہ ہند کے طویل المیعاد استحکام اور اس کی مسابقتی صلاحیت کو بڑھانے میں مدد معاون ثابت ہوں گی۔

تنقیدی افکار

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی کے مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1983 میں چھپا تھا۔ 1986 میں اسے ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا۔ اس میں نظری تنقید، نظریۂ نقد اور مشرق و مغرب کی شعریات کے حوالے سے اہم مضامین شامل ہیں۔ تین نئے مضامین کے اضافے کے ساتھ کونسل نے اس اہم کتاب کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 348، قیمت: -/148 روپے

اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)

مصنف: پروفیسر حنیف کیفی

نظم معریٰ اور آزاد نظم کے موضوع پر یہ کتاب دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔ مصنف نے اپنی شعری روایت کو نظر میں رکھتے ہوئے مغرب میں ان اصناف کے ارتقا کا جائزہ لیا ہے اور مستند نقادوں نے ان کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، ان کے حوالے سے اپنی گفتگو کو وقیع بنایا ہے۔

صفحات: 608، قیمت: -/182 روپے

کلیات میر (جلد اوّل)

مرتب: ظلِ عباس عباسی / تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ

"کلیات میر" کے اس نسخے کی بنیاد ظل عباس عباسی مرحوم کے مرتب کردہ نسخے پر ہے جو پہلی بار 1968 میں شائع ہوا تھا اور چھ مکمل دیوان غزلیات پر مشتمل تھا۔ اس ایڈیشن میں کتابت اور قرأت کی وہ غلطیاں دور کر دی گئی ہیں جو متن میں راہ پا گئی تھیں اور وہ اشعار بھی شامل کر لیے گئے ہیں جو دوسرے معتبر ماخذ سے حاصل ہوئے ہیں۔ ابتدا میں میر کی زندگی اور شاعری پر مستند اہل قلم کی تحریریں، ان کے اہم اقتباسات بھی شامل ہیں۔ میر کے شائقین کے لیے یہ کتاب ایک گراں بہا تحفے کی طرح ہے۔

صفحات: 870، قیمت: 336 روپے

وثائقِ فورٹ ولیم کالج

مصنف: راجندر ناتھ شیدا

فورٹ ولیم کالج اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب ان وثائق کا مجموعہ ہے جو فورٹ ولیم کالج کے قیام اور اس کی تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق نہایت مفید اور مستند معلومات فراہم کرتے ہیں۔ یہ وثائق آنجہانی راجندر ناتھ شیدا نے نہایت احتیاط اور سلیقے کے ساتھ نقل کیے تھے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کا جامع مقدمہ بھی شامل کتاب ہے۔

صفحات: 407، قیمت: -/153 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: مانش پرتیم گوہین
ترجمہ: مشرف علی

کرشن کمار سے گفتگو

سوال: آپ نے جب سے این.سی.ای.آر.ٹی. کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالا ہے، اس وقت سے کونسل نصابی ڈھانچے پر نظرثانی (Curriculum review framework) میں مصروف ہے۔ مستقبل کے لیے آپ کا کیا منصوبہ ہے؟

جواب: ہم اگست میں نظریہ سازی سے متعلق ایک کانفرنس کا انعقاد کررہے ہیں اور پھر نومبر میں ہم اس نظریے کا ایک تفصیلی خاکہ ''این.سی.ای.آر.ٹی.— اگلی دہائی میں'' کے عنوان سے ایک کانفرنس میں پیش کریں گے۔

سوال: این.سی.ای.آر.ٹی. کو فی الوقت کن مسائل کا سامنا ہے؟

جواب: آئینی ترمیم کے ذریعے تعلیم کو ابتدائی سطح پر لازمی قرار دیا گیا ہے اور اس مسئلے پر ہمیں فوری طور پر غوروفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس آئینی ترمیم پر عمل درآمد کرنے کے لیے این.سی.ای.آر.ٹی. کو اپنا نقطۂ نظر اسی کے مطابق بنانا ہوگا۔

سوال: گذشتہ چالیس برسوں میں آپ این.سی.ای.آر.ٹی. کی خدمات کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: گذشتہ چالیس برسوں میں این.سی.ای.آر.ٹی. نے پالیسیوں کی رہنمائی اور نئے پروگراموں کی ترتیب و تنظیم میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تاہم دوسرے اداروں کی طرح یہ بھی بہت حد تک شہروں تک محدود ہوگیا ہے اور دیہی بچوں خصوصاً محروم طبقے کے بچوں کی ضروریات کو پورا کرنے میں اس کی صلاحیت ناکافی ثابت ہوئی ہے۔ چونکہ اسکول کی سطح تک تعلیم ریاستوں کی ذمے داری ہے لہٰذا عام طور پر این.سی.ای.آر.ٹی. ریاستی حکومتوں کے توسط سے اس عمل میں شامل ہے۔ حالانکہ کچھ ریاستیں اس سلسلے میں ہمارے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم انھیں اس عمل میں شامل ہونے کی ترغیب دیں اور خاص طور سے ان ریاستوں کو جہاں ہندی بولی جاتی ہے اور جہاں بنیادی سہولتوں سے محروم اور تارک مکتب (Drop outs) بچوں کے مسائل تشویشناک ہیں۔

سوال: عالم کاری (Globalization) اور تحقیقی سرگرمیوں (Research Activities) کے تئیں این.سی.ای.آر.ٹی. کا نقطۂ نظر کیا ہوگا؟

جواب: ہمیں عالم کاری اور تحقیق کے تمام پہلوؤں پر وسیع پیمانے پر غوروفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ عالم کاری کی وجہ سے سامنے آنے والے مبارزات کا مقابلہ علم، ٹیکنالوجی اور صلاحیت کی تعمیر کے حوالے سے کس طرح کرنا چاہیے، ہمارے مختلف پروگراموں میں اس کی ترجمانی ہونی چاہیے۔ این.سی.ای.آر.ٹی. بنیادی طور پر ایک تحقیقی ادارہ ہے لہٰذا تحقیق کو ہمارے مستقبل کے لائحۂ عمل کا ایک حصہ ہونا چاہیے تاکہ ہندوستان معاشی عالم کاری کے عمل سے پیدا ہونے والے مبارزات کا مقابلہ کرسکے۔ مزید یہ کہ تعلیمی اصلاحات میں سرگرم کردار ادا کرنا ایک جوکھم بھرا کام ہے۔ فی الحال قومی نصاب برائے تعلیم کے ڈھانچے کی نظرثانی (نیشنل کریکولم فریم ورک ریویو) پر پروفیسر یشپال کی قیادت میں کام ہورہا ہے اور اس کے متعلق مرکزی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم (سینٹرل اڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن) میں گفتگو کی جارہی ہے۔ اس پر بحث و مباحثے کے بعد ہماری یہ ذمے داری ہوگی کہ ہم اس کی سفارشات پر عمل درآمد کریں۔

سوال: کیا آپ ہمیں ان مسائل کے بارے میں مختصراً بتائیں گے جن پر گفتگو ہوئی ہے؟

جواب: اس عمل کے دوران ابھی تک جو مسائل ابھر کر سامنے آئے ہیں وہ چنوتی دینے والے ہیں۔ مثال کے طور پر امتحان سے متعلق اصلاح۔ مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے حال ہی میں ایک میٹنگ کی تھی جس میں اس طرح کے سوالات اٹھائے گئے کہ امتحان کا عمل کیوں اتنا زیادہ محنت طلب، سخت اور غیر اصلاح شدہ ہے۔ سی.بی.ایس.ای. اور دیگر بورڈوں کے بشمول این.سی.ای.آر.ٹی. کا اہم کام امتحان کے عمل کو بچوں کے لیے آسان، موزوں اور پسندیدہ بنانا ہے۔

ہمیں ابتدائی درجے سے بارھویں تک ایسی نصابی کتابیں تیار کرنی ہیں جو بچوں کی فطرت اور ذہنی صلاحیت کے عین مطابق ہوں اور ان پر اپنا اثر مرتب کرسکیں۔ لہٰذا این.سی.ای.آر.ٹی. میں بنیادی سوال نصاب سرگرمیوں کے دائرۂ عمل کی توسیع ہے۔ فی الحال ہمارے پاس ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے جو ڈراما، موسیقی، مصوری یا رقص کے شعبے سے تعلق رکھتا ہو۔

سوال: کیا تعلیمی نظام میں اصلاحات کے لیے بھی کچھ اہم سفارشات پیش کی گئی ہیں؟

جواب: شانتا سنہا کی قیادت میں نیشنل فوکس گروپ (NFG) نے ریاستوں میں پنچایتی راج کی سطح سے لے کر اعلیٰ سطح تک تعلیمی ڈھانچے میں اصلاحات کے لیے چند اہم سفارشات پیش کی ہیں۔ این.سی.ای.آر.ٹی. تمام

● پروفیسر کرشن کمار ممتاز ماہر تعلیم اور این.سی.ای.آر.ٹی. کے ڈائرکٹر ہیں۔

ریاستوں کو اس بات پر آمادہ کررہی ہے کہ وہ ان سفارشات پر عمل کریں تاکہ تعلیمی نظام کو زیادہ موثر بنایا جاسکے، خاص طور سے سماج کے ان طبقوں کے درمیان جن کی تعلیمی حالت بہتر نہیں ہے۔ اس میں دلت، قبائلی، لڑکیاں اور معذور بچے شامل ہیں۔

سوال: قومی نصاب برائے تعلیم کے ڈھانچے پر نظرثانی (NCIR) کا کام کب تک مکمل ہوجائے گا؟

جواب: مئی میں مکمل پیکیج قومی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم کی میٹنگ میں پیش کردیا گیا ہے اور جیسے ہی اسے مجلسِ منتظمہ (Executive Committee) اور مجلسِ عامہ (General Committee) کی منظوری ملے گی، ہم درجہ اول، سوم، چہارم، نہم، یازدہم (گیارھویں) کے لیے نیا نصاب جاری کرکے اس پر عمل درآمد کریں گے۔

سوال: گریڈنگ سسٹم کے متعلق این.سی.ای.آر.ٹی. کا کیا نظریہ ہے؟

جواب: سی.بی.ایس.ای. پہلے ہی سے ہمارے ساتھ کام کررہی ہے اور ہم سوالات کے انداز کو بہتر بنانے، اندرونی جانچ پر عمل درآمد کرنے اور مارکنگ سسٹم کے ساتھ گریڈنگ سسٹم کو متعارف کرنے کے لیے آپس میں تعاون کرسکتے ہیں۔ تعلیمی اصلاحات کی شروعات پہلے عملی نکات کی تشخیص سے ہونی چاہیے اور پھر دھیرے دھیرے عملی نکات کے دائرۂ عمل کی توسیع کی جانی چاہیے۔

سوال: کیا اس عمل میں لڑکیوں کے مسائل اور نسوانی اقتدار بخشی (Empowerment) کو بھی شامل کیا جائے گا؟

جواب: چھوٹے بچوں کی تعلیم سے متعلق ایک نیشنل فوکس گروپ (NFG) ہے جس کی صدر میناسوامی ناتھن ہیں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ بیشتر لڑکیاں اپنی ابتدائی تعلیم کے دوران پڑھائی پر توجہ مرکوز نہیں کر پاتیں کیونکہ انھیں اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال بھی کرنی ہوتی ہے۔ اگر ہمارے پاس چھوٹے بچوں کی تعلیم کے حوالے سے ایک معتبر نظام ہو جہاں ایسے بچوں کی دیکھ بھال کی جاسکے جو ابھی اسکول جانے کے قابل نہیں ہیں تب اس طرح لڑکیوں کے سر سے ایسے بچوں کی دیکھ بھال کرنے کی ذمے داری کو کم کیا جاسکتا ہے۔ ہملوگ صنفیاتی حساسیت (Gender Sensitivity) کو فروغ دے کر سماج کے ایک بڑے طبقے کو گھٹتے ہوئے جنسی تناسب کے خطرے سے بھی آگاہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

سوال: عام طور پر نصابی کتب کسی مضمون میں دسترس حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں اور پھر اس کے بعد حل طلب مسائل کی طرف توجہ مبذول کراتی ہیں۔ کیا این.سی.ای.آر.ٹی. کی کتابیں یہ موقع فراہم کرتی ہیں؟

جواب: اعلیٰ معیار کی کتابوں کی کبھی بھی قلت نہیں رہی ہے۔ مسئلہ ہمارے کسی مضمون تک رسائی حاصل کرنے کے طریقۂ کار کا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نصابی کتب کو جامع ہونا چاہیے اور ان سے بچوں کی ذہنیت کی ترجمانی ہونی چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے نصابی کتابیں ایسا تاثر قائم کرتی ہیں جیسے کہ وہ انسائیکلوپیڈیا ہوں۔ یشپال کمیٹی (1993) نے کہا تھا کہ "ہمارے نظام میں بچوں کو بہت کچھ پڑھایا جاتا ہے لیکن اس سے سیکھنے کا موقع بہت کم ملتا ہے۔"

مزید یہ کہ اسکول اور کالج کی تعلیم میں کئی چیزیں مشترک ہیں۔ جب ایک استاد بی ایس سی سال اول کے طلبہ کو کچھ پڑھاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اسے پہلے ہی اسکول میں پڑھ چکے ہیں۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ان اصطلاحات سے واقف ہیں لیکن وہ شاید ہی ان تصورات کو سمجھتے ہوں۔ اس طرح کی سطحی واقفیت آموزشی عمل کے لیے نقصان دہ ہے۔ نصابی کتابوں میں نئی اطلاعاتی ٹیکنالوجی کو بھی شامل کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ سائنس اور ریاضی سے طلبہ کی دلچسپی دھیرے دھیرے کم ہورہی ہے؟

جواب: دلچسپی کم ہونے کا سوال سن کر مجھے یقیناً افسوس ہوتا ہے کیونکہ ہندوستان ایک ایسا ملک رہا ہے جہاں نوجوان طبقہ سائنس اور ریاضی میں نئی چیزوں کو تلاش کرنے میں کافی دلچسپی رکھتا تھا۔ ہمارا تعلیمی نظام ایسا ہے جہاں ہم دلچسپی کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہم سائنس اور ریاضی کو انسائیکلوپیڈیا کا تاثر دینے والی نصابی کتابوں اور ایسے تعلیمی نظام سے جہاں کوچنگ کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے، باہر نکالنے میں کامیاب ہوں گے۔

یہ ایک ایسا کام ہے جس کے لیے سماج کے مختلف طبقوں کو ایک ساتھ آگے آنا چاہیے اور این.سی.ای.آر.ٹی. کو بھی اس سلسلے میں غور وفکر کرنا چاہیے۔ تعلیم کا اہم مقصد تخلیقی صلاحیت کو پروان چڑھانا ہے اور ہمارے صدر جمہوریہ کے بقول "تخلیقی صلاحیت میں ہی ترقی کا راز مضمر ہے۔"

سوال: این.سی.ای.آر.ٹی. کے گذشتہ پانچ برسوں کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں اور تاریخ کی کتاب کا جو مسئلہ ہے اسے آپ کس طرح حل کرنا چاہتے ہیں؟

جواب: میں چیزوں کو ان کی خصوصیات کے حوالے سے دیکھتا ہوں۔ نصاب ایسا ہونا چاہیے جو جواز پر مبنی ہو اور جو ایک معقول ضابطے کے تحت کام کرے۔ اس میں کسی نظام فکر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ تعلیم بحث ومباحثہ، غور وفکر، باہمی ربط اور معقول بنیاد پر فیصلہ کرنے کا ایک عمل ہے۔

نصاب کا مقصد محض دستاویز تیار کرنا نہیں ہے بلکہ صحیح پالیسی کو پیش کرنا ہے۔ دستاویزات تیار کرنے میں ہم کافی آگے ہیں لیکن جب اس پر عمل درآمد کا وقت آتا ہے تو ہمارا جوش وخروش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور یہیں ہمارے لیے مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ تعلیمی نظام کو آسان اور زیادہ لچک دار بنانے کے لیے عملی اقدام کی ضرورت ہے تاکہ بقول پروفیسر یشپال "اسکول میں بچے کی زندگی کو مزید دلچسپ بنایا جائے۔" اگر مقصد یہ ہے تو پھر مجھے نظریاتی ٹکراؤ کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

(بشکریہ "ٹائمز آف انڈیا" نئی دہلی، 6/جون 2005)

اعجاز عبید

کمپیوٹر اور اردو

یہ دور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا ہے۔ کوئی شعبہ ایسا نہیں بچا ہے جس میں کسی نہ کسی مرحلے پر کمپیوٹر کا عمل دخل نہ ہو۔ دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ آج اردو بھی کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے استفادہ کر رہی ہے۔ اردو کے معاملے میں کچھ مشکلات تو ہماری زبان کے حروف کی تعداد ہے جو انگریزی سے کہیں زیادہ ہے (ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ھ لا ء ی ے۔ کل 38۔ مرکب حروف بھ، پھ، تھ، ٹھ وغیرہ کو چھوڑ کر)۔ اس کے علاوہ ہماری زبان کا اہم مسئلہ یہ ہے کہ اردو کے اکثر حروف کی دو دو یا چار چار شکلیں ہیں۔ مثلاً حرف ''م'' کو دیکھیے۔

آم: مفرد شکل

مدد: ابتدائی شکل

کمی: درمیانی شکل

قلم: انتہائی شکل

اردو کا نستعلیق رسم الخط بہت خوبصورت سہی مگر ایک اہم مشکل نستعلیق رسم الخط کے باعث ہے کیوں کہ اکثر حروف کی عمودی حالت اس پر منحصر ہے کہ وہ حرف لفظ کا دوسرا، تیسرا حرف ہے یا چھٹا ساتواں۔ مثال کے طور پر ''م'' کو ہی دیکھیے۔

دو حرفی لفظ ''من'' میں ''م'' کی اصل سطر (Base Line) سے ایک مخصوص اونچائی ہے۔ ایسا ہی دو حرفی لفظ ''مد'' لیجیے۔ اب اس میں م کی شکل اور اونچائی دیکھیے۔ پتہ چلا کہ یہ بعد میں آنے والے حرف پر بھی منحصر ہے۔ اب تین حرفی الفاظ لیجیے۔ ''منت'' اور ''مگر'' نہ صرف یہ کہ ان کی عمودی حالت مختلف ہے، بلکہ ان کی اونچائی بھی دو حرفی الفاظ کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہے۔ چار حرفی لفظ ''منتظر'' لیجیے۔ دیکھیے اب ''م'' اور اونچا ہو گیا ہے۔ اب چھ حرفی لفظ ''مستقبل'' کو دیکھیں۔ اصل سطر سے ''م'' اب کتنا اوپر اٹھ گیا ہے۔ یہی نہیں غور کریں کہ ساتھ ہی دوسرے اور تیسرے حروف بھی اسی طرح اونچے ہوتے جاتے ہیں۔ ''مست'' اور ''مستقبل'' دونوں کے ''س'' کی اونچائی دیکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو پریس اب بھی کتابت سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکا ہے۔ اب بھی بے شمار رسائل اور کتابیں لیتھو پریس میں ہی چھپتے ہیں۔

خطِ نسخ میں اگرچہ اونچائی والا مسئلہ تو نہیں ہے، مگر حروف کی مفرد، ابتدائی، درمیانی اور انتہائی شکلیں بہرحال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اردو ٹائپ رائٹر بنے تو یہی خط نسخ استعمال میں آیا۔ فارسی اور عربی میں تو نسخ خط ان علاقوں کے لیے قطعی عجیب نہیں ہے مگر صاحبانِ اردو اس سے اب بھی کتراتے ہیں۔ مولانا آزاد نے اردو ٹائپ کو رواج دینے کی بہت کوشش کی۔ لیتھو پریس کی چھپائی میں نسخ میں حرف کی ہر شکل کے بلاک بن سکتے تھے اور ان کی کمپوزنگ کر کے پلیٹ بنائی جا سکتی تھی۔ 1950 اور 1960 کی دہائی میں پاکستان میں بھی ٹائپ کو رواج دینے کی کوشش کی گئی۔ لاہور سے ماہنامہ ''سویرا'' اور دوسری کتابیں بھی شائع ہوئیں۔

جب کمپیوٹر کا چلن شروع ہوا تو اس جانب بھی توجہ دی گئی اور ''کاتب'' اور ''راقم'' جیسے سافٹ ویر بنائے گئے جو DOS نامی آپریٹنگ سسٹم پر مبنی تھے اور اس کے بعد جب 1990 کی دہائی میں ونڈوز 3.1 اور ونڈوز 95 بازار میں آئے تو ان آپریٹنگ سسٹموں کی بہتر سہولتوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان میں ''ماہر'' اور ''اردو 98'' نامی سافٹ ویر بنائے گئے۔ ہندوستان میں ''ان پیج'' اور ''صفحہ ساز'' (یا اردو پیج کمپوزر) بنے۔ پوری اردو دنیا میں اب بھی سب سے زیادہ استعمال میں آنے والا سافٹ ویئر ان پیج ہی ہے۔ اکثر پریسوں میں اسی کا استعمال ہوتا ہے، اگرچہ حیدرآباد میں ''صفحہ ساز'' کا دور دورہ ہے چونکہ یہ یہیں بنایا گیا ہے۔

جب کمپیوٹر پر کسی بھی زبان میں کچھ ٹائپ کیا جاتا ہے تو آپریٹنگ سسٹم اسے کئی اعمال سے گزارتا ہے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ کمپیوٹر کی اپنی زبان دوسری ہے جسے بائنری (Binary) کہتے ہیں۔ جب بھی آپ کمپیوٹر کے کی بورڈ پر کوئی کنجی دباتے ہیں تو اس کنجی کا حرف ٹائپ رائٹر کی طرح نہیں ہوتا ہے کہ خود بخود کاغذ پر اتر جائے۔ ٹائپ کیے حرف کو پہلے اسکرین (مانیٹر) پر ظاہر کرنے میں چار عوامل اہم ہیں:

1. کی بورڈ کی قسم
2. آپریٹنگ سسٹم کا تحریری انجن
3. ایک پوشیدہ ''کوڈ''
4. ٹائپ یا فانٹ

اور ان سب کے پیچھے کمپیوٹر کی بائنری زبان جو ہر حرف کو عددی نظام میں سمجھتی ہے۔ عموماً استعمال کے کی بورڈ میں 47 کنجیاں ہوتی ہیں جن سے متن (Text) ٹائپ کیا جاتا ہے۔ باقی کنجیاں دوسرے کام کرتی ہیں۔ اس کے

علاوہ ''شفٹ'' کنجی کے ذریعے سینتالیس کنجیوں سے کل چورانوے حروف اور علامتیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ اردو کے اناليس حروف کی بات ہم کر چکے ہیں۔ اب ان کی مختلف شکلوں پر غور کریں۔

چار چار شکلوں والے حروف: ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن ہ ھ ی: 27 ضرب 4= 108

دو دو شکلوں (ابتدائی اور انتہائی) والے حروف: د ڈ ذ ر ڑ ز ژ و ے۔

2 ضرب 10=20

اس طرح ہمیں 128 حروف چاہیے جو کمپیوٹر کی چورانوے کنجیوں سے نہیں بنائے جاسکتے۔ ان کے علاوہ ہمیں کئی علامتیں، رموز اور اوقاف کی ضرورت بھی ہوگی۔ وقفہ۔ (-)، کاما (،)، سوالیہ نشان (؟)، تخاطب (".") استمراری(!) ، اعداد (ایک سے نو)۔ بلکہ مستعمل علامتوں کی تعداد اردو میں کچھ زیادہ ہی ہے جن میں تخلص، سنہ عیسوی/ ہجری وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب کو شمار کیا جائے تو حروف اور علامتوں کی کل تعداد ڈیڑھ سو سے تجاوز کر جاتی ہے۔

ایک مسئلہ اردو کا دائیں سے بائیں لکھا جانا بھی ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ یہ مشکل ہے کہ اس کے باوجود ہمارے اعداد دائیں سے بائیں ہیں۔

واضح رہے کہ کمپیوٹر محض بائنری زبان سمجھتا ہے اور اس میں مذکورہ بالا چار عوامل اس طرح کام کرتے ہیں کہ جیسے آپ نے امریکی انگریزی کی بورڈ (جو عام طور پر مستعمل ہے) پر 'A' کی کنجی دبائی۔ آپریٹنگ سسٹم کے تحریری انجن نے کی بورڈ سے یہ پیغام (سگنل) وصول کیا مگر عددی نظام میں۔ یہ انجن دیکھتا ہے کہ کی بورڈ کون سا ہے، اور پھر یہ کہ ''کوڈ'' کون سا ہے۔ اگر یہ آسکی (American Standard Code for Information Interchange) ہے تو یہ پیغام عدد ۶۵ کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا اور اس کوڈ کے مطابق یہ انگریزی کا (بلکہ صحیح طور پر کہیں کہ بنیادی لاطینی کا) حرف بڑا اے (A) ہے۔ پھر یہ انجن دیکھتا ہے کہ سافٹ ویئر جو استعمال کیا گیا ہے اس نے کسی فانٹ کی نشان دہی کی ہے یا نہیں۔ اب اگر آپ مائکروسافٹ ورڈ استعمال کررہے ہیں اور آپ نے ایریل فانٹ استعمال کیا ہے، تو اس انجن کے ذریعے اس فانٹ میں ۶۵ عدد والے حرف کی جو شکل یا تصویر (اصطلاح کے مطابق Glyph) ہے، اسے اسکرین پر بھی پیش کیا جائے گا اور جب آپ پرنٹ کا آرڈر دیں گے تو ایریل فانٹ میں "A" چھپ جائے گا۔ اگر سافٹ ویئر ایسا ہے جس میں کسی فانٹ کی نشان دہی نہیں ہے (جیسا کسی ٹیکسٹ ایڈیٹر جیسے ونڈوز نوٹ پیڈ میں) تو سسٹم فانٹ میں 'A' پرنٹ ہوگا۔

اس طرح یہاں جو کوڈ استعمال ہوا وہ آسکی ہے جو اب بھی سب سے زیادہ مستعمل ہے۔ مگر جب عربی کی بورڈ پر یا عربی آپریٹنگ سسٹم میں آپ کی بورڈ پر کچھ ٹائپ کریں گے تو اس کا کوڈ دوسرا ہوگا، اردو کے لیے ہندوستان میں بھی اسی طرح کی کوشش کی گئی اور ایک کوڈ بنایا گیا جس کا نام رکھا گیا Persio Arabic Standard Code for Information Interchange (PARSCII) جس میں عربی، فارسی، اردو، سندھی، کشمیری وغیرہ شامل ہیں۔ مگر اس کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی۔ غرض کسی بھی تحریر کو کمپیوٹر کی زبان میں تبدیل کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی کوڈ بہت ضروری ہے۔ اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے لیے جو سافٹ ویئر تیار کیے گئے وہ تمام اسی آسکی نظام پر مبنی تھے۔ یہ کس طرح کام کرتے ہیں اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے آسکی کوڈ کو سمجھا جائے۔ یہ پہلے سات بٹ بائنری نظام تھا جس میں صفر سے 128 تک کے اعداد مختلف حروف اور علامتوں (بلکہ انگریزی لفظ Character ہی زیادہ بہتر ہے جس میں دو الفاظ کے درمیان کی خالی جگہ بھی شامل ہے جسے کی بورڈ کے اسپیس بار سے بنایا جاتا ہے) کے حق میں مخصوص تھے۔ بعد میں اسے 8 بٹ نظام (8Bit System, 2x2x2x2x2x2x2x2=256) بنایا گیا اور اس طرح اس میں کل دو سو چھپن پر 8 کی قوت) کیریکٹر شامل کیے جاسکے۔ اس میں کچھ تو آپریٹنگ سسٹم کے لیے مخصوص تھے۔ یہ اس طرح ہیں:

ASCII 0 - 32 : سسٹم

ASCII 33-64: ! " # $ % & ' ( ) * + , - . / 0 1 2 3 4 5 6 7 8 9 : ; < = > ? @

ASCII 65-90: A B C D E F G H I J K L M N O P Q R S T U V W X Y Z

ASCII 91-96: [\] ^ - `

ASCII 97 - 122: a b c d e f g h i j k l m n o p q r s t u v w x y z

ASCII 123-126: {|} ~ (127-161 سسٹم)

ASCII 193-255: À Á Â Ã Ä Å Æ Ç È É Ê Ë Ì Í Î Ï Ð Ñ Ò Ó Ô Õ Ö Ø Ù Ú Û Ü Ý Þ ß à á â ã ä å æ ç è é ê ë ì í î ï ð ñ ò ó ô õ ö ø ù ú û ü ý þ ÿ

اب میں مقبول سافٹ ویئر ان پیج کی مثال دیتے ہوئے بتانے کی کوشش کروں گا کہ یہ کس طرح کام کرتا ہے اور مثال اسی لفظ کی لوں جو پہلے بھی لی تھی یعنی لفظ ''مستقبل''۔ اب میں یہ فرض کرکے چل رہا ہوں کہ آپ کو معلوم ہے کہ حرف م کس طرح ٹائپ ہوگا اور حرف س کس کنجی سے۔ اب آپ کسی کنجی کی مدد سے حرف م ٹائپ کرتے ہیں تو اسکرین پر آپ کو مفرد حرف م نظر آئے گا۔ پھر کمپیوٹر (صحیح طور پر اس کا ٹیکسٹ انجن) یہ انتظار کرے گا کہ آپ اس حرف کے بعد اسپیس بار دبا کر خالی جگہ چھوڑتے ہیں یا فوراً کوئی دوسرا حرف ٹائپ کرتے ہیں۔ اگر آپ نے اسپیس بار دبائی تو وہ سمجھ لے گا کہ یہ

"م" لفظ کا آخری حرف ہے اور اس کی شکل یہی مفرور رہے گی۔ مگر جب آپ "مستقبل" ٹائپ کرنے کے لیے اگلا حرف "س" ٹائپ کریں گے تو یہ انجن پہلے دیکھے گا کہ "م" اور "س" کی ملحقہ صورت کیا ہے اور اب آپ کو "مس" دکھائی دے گا۔ آپ کے "ت" ٹائپ کرنے پر "م" س کی شکل فوراً بدل کر "مست" ہوجائے گی اور اس کے بعد کا "ق" ٹائپ کرنے پر "مستق"، پھر "ب" ٹائپ کرنے پر "مستق"، "مستقب" سے بدل جائے گا اور پھر "ل" کے بعد "مستقبل"۔ اور جب آپ نے اس کے بعد اسپیس بار (یا وقفہ۔ یا کاما) دبائی تو یہ انجن جان لے گا کہ اس لفظ کی یہی آخری شکل ہے اور "مستقبل" کی شکل میں کوئی مزید تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔ اس سافٹ ویئر میں اس طرح استعمال میں آنے والے حرفوں کے ہر مجموعے کی شکلیں (Glyphs) موجود ہیں اور یہ سافٹ ویئر کا ہی کام ہے کہ وہ دیکھے کہ اگلی شکل جو بننے والی ہے وہ کسی فانٹ میں ہے۔ اس شکل کا متعلقہ فانٹ کا آسکی کوڈ کیا ہے۔ اب آپ سوچ سکتے ہیں کہ "م" فانٹ نمبر ایک میں انگریزی کے "جی" کی جگہ ہے تو "مست" ممکن ہے کہ فانٹ نمبر دس میں سوالیہ نشان کی جگہ پر۔ اس طرح اس سافٹ ویئر میں نستعلیق کے لیے کل 85 فانٹ استعمال کیے گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ ہر فانٹ میں وہی صفر سے 255 (کل 25) آسکی کوڈ والے کیریکٹرز استعمال میں آئے ہیں۔ غرض ان پیج میں ان سارے فانٹس کو ایک ہی نام دیا گیا ہے، نوری نستعلیق۔ جب کہ پورا لفظ "مستقبل" ہی ان میں سے ایک فانٹ کی شکل ہے۔

آسکی کوڈ پر منحصر کسی بھی نظام کے سافٹ ویئر کے ساتھ یہی مشکل ہے کہ جب آپ مجھے اس کی فائل دیں گے تو مجھے بھی اس سافٹ ویئر کی ہی ضرورت ہوگی جو میں اسے پڑھ سکوں۔ ہندی وغیرہ کے سافٹ ویئر میں تو یہ ہے کہ آپ مجھے فانٹ کی فائل بھی دے دیں تو میں اس فانٹ کو انسٹال کرکے آپ کی تحریر پڑھ سکوں گا۔ مگر ان پیج میں تو آپ کی تحریر میں 85 فانٹ ہیں، لفظ "تحریر" میں ہی دو الگ الگ فانٹ ہیں "تحر" کا الگ اور "یر" کا الگ۔ پھر آپ مجھے ان پیج کی فائل دیں تو میں بغیر ان پیج کے تو پڑھ نہیں سکوں گا۔ اس طرح اس میں فائل Share نہیں کی جاسکتی۔ اس کی ترکیب ان پیج والوں نے ہی یہ نکالی ہے کہ آپ ہر صفحے کو ایک تصویر (Graphica) کی شکل میں تبدیل (Import) کرسکتے ہیں۔ اب آپ اس تحریر کی تصویر دیکھ سکتے ہیں (جو کہ ایک GIF فائل کی شکل میں ہوتی ہے) انٹرنیٹ کی دنیا میں اردو سے متعلق بے شمار ویب سائٹوں میں اسی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔

مگر پرنٹنگ پریس میں جہاں نئی نئی ٹیکنالوجی اپناتے ہوئے ہر تحریر کو مختلف طریقے سے الگ کیا جاتا ہے۔ مثلاً رنگوں کو علاحدہ کیا جاتا ہے جو پریس میں استعمال کی جانے والی تین یا چار رنگوں میں ہی ہر رنگ پیدا کرسکے۔ ان کو تحریری فائل کی ایک اور شکل درکار ہوتی ہے جسے پرنٹر کی زبان میں پوسٹ اسکرپٹ کہتے ہیں۔ یہ سب ان پیج میں ممکن نہیں۔ مگر ان پیج کے حالیہ ورژنوں میں یہ سہولت بھی ہے کہ آپ اس کے ٹیکسٹ فریم کو تصویر کی طرح کاپی کرکے کورل ڈرا نامی ڈی.ٹی.پی. سافٹ ویئر میں پیسٹ کرسکتے ہیں اور وہاں اس کے ہر حرف کو بنایا بگاڑا جاسکتا ہے اور اس طرح پرنٹنگ پریس والے عموماً اردو تحریر چھاپتے ہیں۔

یہ سب مشکلات اس باعث بھی تھیں کہ اردو کا الگ سے کوئی قابل قبول کوڈ موجود نہیں تھا۔ اردو ہی نہیں، دنیا کی بیشتر زبانوں کا یہی حال تھا۔ کچھ زبانیں تو اوپر سے نیچے بھی لکھی جاتی ہیں جیسے چینی اور جاپانی۔ ان زبانوں میں حروف نہیں بلکہ پورے الفاظ کے لیے کوئی شکل استعمال کی جاتی ہے۔ 1991 میں کمپیوٹر کی کچھ بڑی کمپنیوں جیسے ایپل، مائکروسافٹ، اڈوبی وغیرہ نے ایک نئے کوڈ کے بارے میں سوچا۔ اسے آفاقی کوڈ (Universal/Unicode) کہا جاتا ہے۔ یہ پہلے .1 بٹ نظام تھا اور اس طرح اس میں دو پر .1 کی طاقت یعنی .552 کیریکٹرس کی گنجائش ہے اور اب اسے 32 اور .4 بٹ نظام کے طور پر ترقی دی جارہی ہے۔ تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس میں کتنی زبانوں کے ہر کیریکٹر کو شامل کیا جاسکے گا۔ اردو اس سلسلے میں عربی جسے کا ہی استعمال کرتی ہے اور اسی میں سندھی، پشتو، کشمیری وغیرہ کئی زبانوں کے کیریکٹر شامل ہیں۔ ہندی سے حاصل اردو کے مخصوص حروف ٹ، ڈ، ڑ وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں اور تین نقطوں والی ف بھی جو سندھی میں شامل ہے۔ اب اس کوڈ کا استعمال کرکے تحریر کی جائے تو فانٹ کی کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ جس طرح کمپیوٹر کسی مخصوص آسکی فانٹ کی عدم موجودگی میں کوئی بھی فانٹ استعمال کرلیتا تھا اور دوسری زبانوں کی مخصوص فانٹ کی تحریروں کو پڑھنے کی کوشش میں ÕÑÐÎÓÓÓÎ جیسے حروف دکھائی دیتے تھے، اب ایسا نہیں ہوگا۔ اگر یونی کوڈ میں تحریر لکھی جائے تو جس فانٹ میں آپ مضمون ٹائپ کررہے ہیں، وہ اگر کسی کے پاس موجود نہ بھی ہو تو بھی کمپیوٹر کوئی دوسرا فانٹ ایسا منتخب کرلے گا جس میں اردو کے کیریکٹر شامل ہوں، جیسے عام فانٹ ٹائمس، ایریل یا ٹاہوما۔ یہ تحریر نستعلیق میں نہ سہی، نسخ فانٹ میں پڑھی تو جاسکے گی۔ یہ یونی کوڈ نظام مستقل ترقی پذیر ہے اور حال ہی میں یکم اپریل کو اس کا 4.2 ورژن جاری کیا گیا ہے۔ اب اردو کی کئی ویب سائٹیں بھی جیسے بی بی سی اردو، جنگ، اردوستان (www.urdustan.com, www.jang.com, www.bbc.urdu.com) اسی کوڈ کا استعمال کررہی ہیں۔ ایک عالمی

پروجیکٹ ہے جسے وکی پیڈیا کا نام دیا گیا ہے اور یہ ایک ایسا آن لائن انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں آپ خود بھی اضافہ یا تبدیلی کرسکتے ہیں، اس کا بھی اردو چینل دستیاب ہے جسے www.wikipedia.org/urdu پر دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ بھی اسی یونی کوڈ کے سبب ممکن ہوسکا ہے۔

مائکروسافٹ کے آپریٹنگ سسٹم ونڈوز 2000 اور بطور خاص XP پوری طرح یونی کوڈ پر منحصر ہیں۔ ایک اور آزاد آپریٹنگ سسٹم لنکس تو تقریباً دس سال سے اس کوڈ کو استعمال کر رہا ہے۔ اب آپ اس کے اہل ہیں کہ سادہ ٹیکسٹ ایڈیٹر جیسے نوٹ پیڈ میں بھی اردو میں تحریر لکھ سکتے ہیں۔ اسی کوڈ کا استعمال کرکے ای میل بھی بھیج سکتے ہیں جسے حاصل کرنے والا بھی پڑھ سکے گا۔ اس کے لیے کسی مخصوص سافٹ ویئر کی چنداں ضرورت نہ ہوگی۔ اس میں دو رائے نہیں کہ یونی کوڈ کا ہی مستقبل میں دور دورہ ہوگا اور اب آسکی نظام قریب المرگ ہے۔

کچھ عرصے سے پاکستان میں اور اب ہندوستان میں www.indilinux.org کی یہ کوششیں جاری ہیں کہ لنکس نامی پورے آپریٹنگ سسٹم کو اردو میں ڈھال دیا جائے۔ اس طرح کہ آپ کو اپنے ڈیسک ٹاپ پر ہر حرف اردو کا نظر آئے۔ عربی اور فارسی میں یہ کوشش کامیابی سے کی جاچکی ہے اور www.arabeyes.org نے عربکس نامی آپریٹنگ سسٹم اور www.shabdix.org نے شبدیز نامی آپریٹنگ سسٹم بنایا ہے اور یہ ایسی سی ڈی کی صورت میں ہے کہ اسے آپ انسٹال کیے بغیر چلا سکتے ہیں اور کام کرسکتے ہیں یا کم از کم اس کی کھوج بین (explore) کرسکتے ہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ اس آفاقی کوڈ کے باعث اردو میں کام کرنا اتنا آسان ہونے کے باوجود اس کے استعمال کی تربیت نہیں دی جارہی ہے۔ کمپیوٹر رسالے (جو اردو میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں) ہی نہیں، دوسری زبانوں اور انگریزی کے رسالے بھی اس سلسلے میں خاموش دکھائی دیتے ہیں۔ حالاں کہ اس کوڈ کے ذریعے ہندوستان کی ہی نہیں، دنیا کی ہر زبان لکھی جاسکتی ہے۔ اس طرح کئی اکادمیاں اردو ڈی ٹی پی کی تربیت دیتی ہیں مگر میری ناقص معلومات کے مطابق یہ سب بھی محض ان پیج اور اردو پیج کمپوزر کی ہی تربیت دیتی ہیں۔ امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اس سلسلے میں پیش قدمی کرے گی۔ جب تک یہ بات عام نہیں ہوتی کہ اب کسی زبان میں کام کرنے کے لیے کسی خاص سافٹ ویئر کی ضرورت نہیں، اردو دنیا میں ہر طرف ان پیج کا استعمال، بلکہ اگر سچ کہوں تو اس کی چوری (Piracy) جاری رہے گی۔ حالاں کہ کورل ڈرا ڈی ٹی پی سافٹ ویئر کا تازہ ورژن 12 بھی اردو یونی کوڈ کی صلاحیت رکھتا ہے اور سیدھے اسی میں ڈی ٹی پی کا کام کیا جاسکتا ہے اور ورڈ ایکس پی میں بھی (پیج میکر نام کا سافٹ ویئر اس معاملے میں ابھی پیچھے ہے)۔

اردو دنیا (اور ''اردو دنیا''، رسالہ بھی) جتنی جلدی یونی کوڈ کو اپنا سکے گی، اردو کی ترقی کی راہیں دورِ جدید میں مزید ہموار ہوں گی۔

"Maman", 9-1-25/A/1, Hashim Nagar,
Langar House, Hyderabad-500 008

مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت

مصنف: وہاب قیصر

مولانا ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ ان کے سیاسی تدبر، علمی فتوحات اور صحافتی خدمات پر کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ کم ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ انھیں سائنس سے بھی بے حد لگاؤ تھا اور انھوں نے آزادی کے بعد بطور وزیرِ تعلیم ملک کو سائنسی اور ٹیکنالوجیکل ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 180، قیمت: -/109 روپے

تنقید عقل محض

مصنف: ایمانوئل کانٹ، مترجم: ڈاکٹر سید عابد حسین

یہ جرمن مابعد طبیعیاتی فلسفے کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے جو براہ راست جرمن زبان سے کیا گیا ہے۔ فاضل مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین نے مصنف کے خیالات کی وضاحت اور زبان کی سلاست کو بطور خاص ملحوظ رکھا ہے اور منشائے مصنف تک قارئین کی رسائی کو آسان کردیا ہے۔ یہ کتاب 1948 میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کی تھی۔ اس کی افادیت کے پیش نظر انجمن اور محترمہ صغریٰ مہدی کی اجازت سے کونسل نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔

صفحات: 488، قیمت: -/158 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

محمد ظفر الدین

اردو نصاب کی ترتیب میں ترجمہ اور ابلاغیات

دور حاضر میں کمپیوٹر اور صحافت کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور زندگی کے ہر شعبے میں ان کے عمل دخل نے سماج کے ہر طبقے کو براہ راست متاثر کیا ہے۔ کمپیوٹر اور اس سے متعلق سہولتوں مثلاً انٹرنیٹ، ویب سائٹ، کتابوں کی سی ڈی، ای. ڈکشنری وغیرہ کی روز افزوں ترقی نے کم وبیش تعلیم یافتہ سماج کے ہر فرد کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور یہ تمام سہولتیں انسانی زندگی کا لازمی جزو بن گئی ہیں۔ یہی حال صحافت کا ہے۔ صحافت جب تک کاغذوں پر محدود تھی، یعنی اس کا ذریعۂ ترسیل صرف اخبارات و رسائل تھے، اس وقت تک اس کی صورت حال مختلف تھی۔ ریڈیو اور پھر ٹیلی ویژن کی ایجاد نے صحافت کو ایک الگ ہی دنیا سے روشناس کرایا جو یقیناً وسیع و عریض تھی اور بہتوں کے لیے حیرت انگیز بھی۔ لیکن گذشتہ دو دہائی سے الیکٹرانک میڈیا کا جو انقلاب آیا ہے اس نے صحافت کی کایا پلٹ کر دی ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس عہد میں صحافت نے غیر معمولی ترقی کی۔ خبروں کی فوری ترسیل کا معاملہ ہو یا جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے خبروں کی باریکیوں کا تجزیہ کرنا ہو، ہر میدان میں صحافت نے بہت لمبی جست لگائی ہے۔

کمپیوٹر اور صحافت کی اس مقبولیت اور ترقی نے ملک کے تعلیمی نظام پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے۔ یوں تو بیشتر یونیورسٹیوں میں ان دونوں مضامین، یعنی کمپیوٹر اینڈ انفارمیٹکس اور جرنلزم اینڈ ماس کمیونیکیشن کے باقاعدہ شعبے قائم ہیں لیکن ان کی اثر انگیزی کا عالم یہ ہے کہ بعض دیگر مضامین اور زبان کے شعبوں نے انھیں کلی یا جزوی طور پر شامل نصاب کر لیا ہے۔ یعنی اپنے مستقل نصاب میں انھیں ایک یا دو پرچے کے طور پر شامل کیا ہے۔ بعض شعبے ایسے بھی ہیں جنھوں نے کمپیوٹر اور صحافت کی اہمیت کے پیش نظر اپنے مستقل کورسوں مثلاً ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی یا کوئی سرٹیفکیٹ یا ڈپلوما وغیرہ کے علاوہ خصوصی طور پر ان مضامین سے متعلق نئے کورس متعارف کیے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ ایسے شعبوں کے مستقل کورسوں کے مقابلے یہ نئے کورس طلبہ کو زیادہ متوجہ کر رہے ہیں۔ یعنی اگر کسی شعبے میں ایم اے کے طلبہ کی تعداد 30 ہے تو وہاں شروع کیے گئے کمپیوٹر کورس میں 60 امیدواروں نے داخلہ لیا۔ یا اگر کسی شعبے میں ایم اے کے طلبہ کی تعداد 25 ہے تو وہاں شروع کیے گئے صحافت کے کورس میں ڈیڑھ سو طلبہ نے داخلہ لیا۔ یہ ایسی صورت حال ہے جو اس بات کا واضح پتہ دے رہی ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام میں جہاں کہیں بھی روزگار کے مواقع نظر آتے ہیں طلبہ کی بڑی تعداد اس جانب متوجہ ہونے لگتی ہے اور اسی لیے کسی بھی شعبے میں کورس یا نصاب کی تیاری کے موقعے پر طلبہ کے رجحان یا کورس کی مانگ کا لازمی طور پر خیال رکھا جانا چاہیے۔

تمام زبانوں کی صحافت میں ترجمہ ایک لازمی جزو ہے اس لیے فطری طور پر زیادہ تر دانش گاہوں میں ترجمے کو بھی صحافت کے پرچے میں علاحدہ باب کی حیثیت سے یا بعض جگہوں پر ایک مکمل پرچے کی حیثیت سے شامل نصاب کیا گیا ہے۔

دہلی یونیورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں تیسرے سمسٹر کے دوران مضمون اور ترجمہ (Essay and Translation) اور ماس میڈیا اختیاری مضامین کے طور پر موجود ہیں۔ پہلے اختیاری مضمون کے نصف حصے کا احاطہ کرنے کے لیے طلبہ کو صرف کسی ایک موضوع پر طویل مضمون لکھنا ہوتا ہے۔ اس مضمون کا تعلق عموماً کسی ادیب، تحریک یا رجحان سے ہوتا ہے۔ پرچے کا دوسرا حصہ صرف ترجمے کے لیے مختص ہے جس میں ترجمے کے اصول، تکنیک، قسمیں، اصطلاحات اور ترجمے سے متعلق اہم اداروں اور شخصیتوں کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ اس یونیورسٹی کا ماس میڈیا کا پرچہ طلبہ کے لیے کافی مفید ہے۔ نصاب میں ماس میڈیا کی تاریخ وغیرہ سے احتراز کرتے ہوئے راست طور پر ریڈیو ٹی وی کے لیے فیچر، ڈرامے، دستاویزی فلمیں، خبریں اور تبصرے لکھنے کی تکنیک پر توجہ دی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ طلبہ کو اس طرح سے مشق کرائی جاتی ہے کہ ان میں صحافت کے حوالے سے تخلیقی اظہار کی صلاحیتیں پیدا ہو سکیں۔ اس کے علاوہ دہلی یونیورسٹی میں ''پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما کورس ان اردو ٹرانسلیشن اینڈ ماس میڈیا'' کے عنوان کے تحت ایک سالہ کورس بھی موجود ہے۔ یہ کورس ترجمہ، صحافت، عملی تجربہ اور مقالہ، ریڈیو ٹی وی، فلم اور ماس میڈیا سمیت پانچ پرچوں پر مشتمل ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ''عوامی ذرائع ترسیل: اصول اور عمل'' ایم اے فائنل کا ایک لازمی پرچہ ہے۔ اس یونیورسٹی میں ترجمے پر علاحدہ کوئی پرچہ نہیں ہے البتہ عوامی ذرائع ترسیل ہی کے پرچے میں ترجمہ نگاری کے لیے ایک حصہ مختص کیا گیا ہے۔

بنارس ہندو یونیورسٹی میں بھی ماس میڈیا کا ایک مکمل پرچہ ہے جسے تاریخی، نظریاتی اور عملی عنوانات کے تحت تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس پرچے میں نہ تو ترجمہ نگاری کا کوئی باب ہے اور نہ ہی جدید تکنیک سے کوئی بحث کی گئی ہے۔ یہ پرچہ روایتی انداز کا ہے جہاں جام جہاں نما، اودھ اخبار اور اودھ پنچ وغیرہ کے تذکرے سے پرچے کا آغاز ہوا ہے اور آخر میں اخبار کے مختلف عہدیداروں مثلاً سب ایڈیٹر اور پروف ریڈر وغیرہ کی کارکردگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نظریاتی حصے میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے متعارف کرایا گیا ہے۔

ممبئی یونیورسٹی کے نصاب میں ایک اختیاری مضمون کے طور پر صحافت کا پرچہ موجود ہے۔ ایک علاحدہ پرچے کو چار مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس کا ایک جزو ترجمہ بھی ہے۔ اس طرح یہاں پر صحافت اور ترجمہ دونوں موجود ہے۔

پٹنہ یونیورسٹی میں صحافت اور ذرائع ابلاغ ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے نصاب میں شامل ہے۔ اکثر یونیورسٹیوں میں جہاں ذرائع ابلاغ ایک

اختیاری مضمون کی حیثیت سے شامل ہے وہاں اس مضمون کو دیگر مضامین پر فوقیت حاصل ہے۔

کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ نے صحافت کے ساتھ ترجمے کو بھی شامل نصاب کیا ہے۔ وہاں کے نصاب میں Study of Urdu journalism & Urdu software کے نام سے ایک پرچہ شامل کیا گیا ہے۔ یہاں طالب علم کو اردو سافٹ ویئر کی جانکاری بھی فراہم کی جاتی ہے۔

بنگلور یونیورسٹی کے ایم.اے کے نصاب میں کمپیوٹر، ترجمہ اور صحافت کے الگ الگ پرچے موجود ہیں لیکن بنگلور یونیورسٹی ہی کے مراسلاتی کورس میں کمپیوٹر کا پرچہ تو موجود ہے لیکن ترجمہ نگاری اور ابلاغیات اس میں شامل نہیں۔

حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی میں ترجمے اور ابلاغیات کو دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہاں ''ترجمہ: اصول اور عمل'' کا ایک مکمل پرچہ ہے جبکہ صحافت سے متعلق الگ الگ سمسٹر میں دو پرچے شامل ہیں۔ تیسرے سمسٹر میں پرچے کا عنوان ''اردو صحافت کا تعارف'' ہے جبکہ چوتھے سمسٹر میں ''سمعی و بصری وسائل: ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے لکھنے کے طریقے'' کے تحت تسلسل قائم کیا گیا ہے۔ یہ تینوں پرچے اگرچہ اختیاری مضامین کی حیثیت سے شامل نصاب ہیں لیکن الگ الگ سمسٹر میں ہونے کی وجہ سے اگر کوئی طالب علم چاہے تو وہ اس زمرے کے تینوں پرچوں کو بھی پڑھ سکتا ہے۔

حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے گذشتہ برس سے ''ماس کمیونیکیشن ٹرانسلیشن ٹیکنکس ان اردو'' کا ایک سالہ پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما کورس شروع کیا ہے۔ اس میں روایتی صحافت، جدید ذرائع ابلاغ اور ترجمے کا ایک انتہائی مبسوط آمیزہ تیار کیا گیا ہے۔ اسی طرح کا ایک سالہ پی.جی ڈپلوما کورس کافی دنوں سے دہلی یونیورسٹی میں بھی دستیاب ہے لیکن چونکہ وہ کورس کیمپس طریقۂ تعلیم کے تحت دستیاب ہے اس لیے وہاں عموماً اسی شعبے کے طلبہ داخلہ حاصل کرتے ہیں اور تعداد بہت محدود رہتی ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں صحافت کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ یہاں ایم.اے کے نصاب میں مجموعی طور پر صحافت و ترجمے سے متعلق چھ پرچے شامل ہیں۔ لیکن یہ سبھی پرچے طالب علموں کے لیے لازمی نہیں ہیں چونکہ ان میں کئی پرچے اختیاری بھی ہیں۔ یہ پرچے تیسرے سمسٹر میں ذرائع ابلاغ کا تعارف، مطبوعہ ذرائع ابلاغ اور رپورٹنگ و ایڈیٹنگ کے ناموں سے موسوم ہیں جبکہ چوتھے سمسٹر میں ان پرچوں کو ''ریڈیو بحیثیت ذرائع ابلاغ''، ٹی وی، فلم اور ویڈیو'' اور'' ذرائع ابلاغ کا ترجمہ'' کے نام دیے گئے ہیں۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا نصاب ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کے مقابلے سب سے نیا اور تازہ نصاب ہے جو اسی سال ترتیب دیا گیا ہے۔ اس یونیورسٹی میں کیمپس اور فاصلاتی دونوں ہی طریقوں سے ایم.اے اردو کا تعلیمی سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ یہاں دونوں ہی طریقۂ تعلیم میں ترجمہ نگاری اور ابلاغیات کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔

ہماری یونیورسٹیوں میں ترجمے اور ابلاغیات کی تدریس پر خاصی توجہ دی جارہی ہے لیکن اسی کے ساتھ ان مضامین کے بعض مسائل اور طریقۂ کار پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ طلبہ کے اندر ان مضامین میں مہارت پیدا کرنے کے امکانات کافی ہیں اور ان مضامین کے تقاضے بھی بہت ہیں لیکن ان تقاضوں کو اردو ادب کے کورس میں پورا کرنا ممکن نہیں چونکہ اردو ادب کے کورس میں کمپیوٹر ہو یا ترجمہ وصحافت، یہ ایک اضافی جزو کے طور پر پڑھائے جاتے ہیں۔ ضرورت ان مضامین کے علاحدہ کورس شروع کرنے کی ہے۔ آج شعبۂ اردو سے فارغ التحصیل طلبہ محض خالص اردو (ادب) کی ملازمتوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان کے استقبال کے لیے ترجمے اور صحافت کی ایک وسیع دنیا بھی موجود ہوتی ہے۔ جہاں طلبہ اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق مقام حاصل کرتے ہیں۔ طالب علم اگر کورس کے دوران ان مضامین پر خصوصی توجہ دے اور مہارت پیدا کرلے تو وہ حصول معاش کے لیے ملازمت کا محتاج نہیں رہتا بلکہ اس کے آگے خود روزگار کے امکانات بھی موجود ہوتے ہیں۔ آج اردو نصاب میں شامل ترجمے اور ابلاغیات کے پرچوں کو زیادہ سے زیادہ مفید اور ہمہ جہت بنانے کی ضرورت ہے جس کے لیے طلبہ کو عملی تجربوں سے گزارنا ہوگا۔ صحافت کے پرچے میں رابطہ عامہ یا تعلقات عامہ کو اکثر جگہوں پر نظرانداز کیا گیا ہے جبکہ آج صحافت اور ذرائع ابلاغ کے مستقل کورسوں میں Public Relations کو کافی اہمیت دی جارہی ہے۔ لہٰذا اردو کورس کے نصاب میں بھی صحافت یا ذرائع ابلاغ کے پرچے کے تحت طالب علم کو تعلقات عامہ کے بنیادی اصولوں سے واقف کرانا نہایت مفید ثابت ہوگا۔

جہاں کہیں ترجمے کا مکمل پرچہ شامل نصاب کیا جائے وہاں زیادہ سے زیادہ عملی تجربے پر توجہ دی جانی چاہیے۔ عملی تجربے کی نوعیت کچھ ایسی ہونی چاہیے کہ طالب علم کو سائنس، آرٹس، کامرس کے مختلف مضامین کے انگریزی متن سے سابقہ ہوجائے۔ بلکہ اگر ترجمے کے پرچے میں طلبہ کو انگریزی کے بنیادی قواعد اور جملوں کی ساخت سے واقف کرانے کی کوئی راہ نکالی جائے تو وہ بھی طالب علموں کے لیے سودمند ثابت ہوسکتی ہے۔ صحافت کی تدریس کے وقت ہمیں صحافت کی تاریخ سے زیادہ موجودہ دور میں ایک کامیاب صحافی کے لیے درکار صلاحیتوں پر توجہ دینی ہوگی۔ اخبارات ورسائل کے علاوہ دیگر مواصلاتی نظام کی باریکیوں سے طلبہ کو واقف کرانا ہوگا۔ اخبارات کے دفاتر یا ریڈیو، ٹی.وی کے مراکز کے سرسری جائزے کے بجائے دلچسپی رکھنے والے طلبہ کو ان اداروں سے وابستہ کرکے ان کی تربیت کا بندوبست لازمی طور پر کیا جائے۔ ہمارے طالب علم جب جدید آلات اور تکنیک سے براہ راست واقف ہوں گے تو فطری طور پر ان میں زیادہ مہارت اور خود اعتمادی پیدا ہوگی اور صاحبانِ اردو کے لیے جہاں بے روزگاری کا شکوہ عام ہے وہ بھی ختم ہوجائے گا۔

Translation Division
Maulana Azad National Urdu University,
Gochibowli, Hyderabad-500 032, A.P.,

□□□

مولا بخش

اردو زبان اور نئی نسل

عہدِ حاضر میں اردو دنیا کی ایک بڑی زبان کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ یہ زبان روزمرہ کے معمولات میں اپنا فعال کردار ادا کررہی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اردو والے بھی اطلاعاتی انقلاب کے اس عہد میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے مستفید ہورہے ہیں۔ اردو کے مختلف اداروں مثلاً قومی اردو کونسل اور اردو اکادمیوں نے انٹرنیٹ، کمپیوٹر، سائبر اسپیس کی تفہیم کے لیے بعض کورسوں کی شروعات کی ہے جن کے خاطر خواہ نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

اردو کے شائقین اور سرکاری و غیر سرکاری اداروں کی کوششوں سے انٹرنیٹ پر بہت سے اردو کے پروگرام شروع ہو چکے ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ اردو کے مصنفین سے متعلق معلومات انٹرنیٹ پر آسانی سے دستیاب ہیں۔ ان کے علاوہ www.geocities.com, paris/metro 1442. inden html ادیب ڈاٹ کوم، اردو لائف ڈاٹ کوم، ماہنامہ اردو ڈاٹ کوم، اردو نیٹ کوم، اردو کا صفحہ، اردو کی دنیا ڈاٹ کوم، اردو دوست ڈاٹ کوم، ویب اخبارات اور رسائل کے ساتھ ساتھ ماہنامہ اردو دنیا، روزنامہ سیاست، نوائے وقت، بزم، اخبار جہاں، اردو ٹائمز، اردو تہذیب ڈاٹ کوم دہلی کے علاوہ بہت سے نئے شاعروں کے اپنے نجی ویب سائٹ بھی موجود ہیں۔ مشاعرہ ڈاٹ کوم کو دسواں بڑا ادیب سائٹ مانا گیا جسے 2002-2001 کا گولڈن ویب ایوارڈ بھی حاصل ہوا ہے۔ اسی طرح اردو شعر و ادب، اردو لغت اور اخبارات وغیرہ بھی ویب سائٹ پر دعوت مطالعہ دے رہے ہیں۔ تفصیل سے قطع نظر اردو زبان نے بڑی سرعت کے ساتھ اپنی ہر دل عزیزی ثابت کی ہے۔ اردو چینل بھی مارکیٹ میں آچکے ہیں اور اپنے ناظرین سے داد تحسین وصول کررہے ہیں۔ ان میں ای ٹی وی اردو چینل سرفہرست ہے جس کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہورہا ہے۔ علاوہ ازیں اردو کے بہت سے کتب خانے بھی انٹر نیٹ پر دستیاب ہیں۔

یہ جملہ امور اردو کی مقبولیت کو ثابت کرتے ہیں لیکن افسوس کہ اردو سے متعلق ایسی غلط فہمیاں سیاست اور فرقہ وارانہ ذہنیت نے پیدا کردی ہیں جو نئی نسل کو اردو سے متنفر کررہی ہیں۔ اگر انھیں دور نہیں کیا گیا تو نئی نسل اور اردو دونوں کا شدید نقصان ہوگا۔ ایک ایسا نقصان جو ہندوستان کی سالمیت اور مشترکہ تہذیب کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہوگا۔ کیوں کہ اردو ہی ہندوستان کی وہ واحد زبان ہے جس نے اس ملک کی مختلف قوموں کو متحد کرنے میں اہم رول ادا کیا تھا اور آج بھی یہ زبان بلاتفریق مذہب و ملت ملک و بیرون ملک مختلف اقوام کے رابطے کی زبان بنی ہوئی ہے۔ اس ضمن میں سب سے بڑی اور مضحکہ خیز غلط فہمی یہ پیدا کی گئی ہے کہ ''اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔'' سوال یہ ہے کہ کیا زبان کی کوئی حد مقرر کی جاسکتی ہے؟ کیا کسی زبان کو کسی مخصوص مذہب، ذات یا فرقے سے جوڑا جاسکتا ہے؟ اگر اردو مسلمانوں کی زبان ہے تو پنڈت رتن ناتھ سرشار، پریم چند، سرور جہاں آبادی، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، پنڈت دیا شنکر نسیم، برج نارائن چکبست، گیان چند جین، جگن ناتھ آزاد اور گوپی چند نارنگ نے اردو میں کیوں لکھا۔ اس قسم کی غلط فہمیاں وہی پیدا کرتا ہے جس کا علم محدود ہو۔ دراصل زبان اسی کی ہے جو اسے بولے، اس میں سوچے اور اپنے خواب سجائے۔

''ملاپ''، ''پرتاپ''، ''ہندسماچار''، ''راشٹریہ سہارا'' وغیرہ اخبارات کون نکال رہا ہے؟ رسالہ ''مستانہ جوگی'' میں جین مذہب سے متعلق معروضات اردو میں ہی بیان کیے جاتے ہیں کیوں؟ دراصل اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دینے والے یہ نہیں جانتے کہ ہندوستان ایک کثیر ثقافتی، کثیر لسانی ملک ہے۔ ہندوستان دراصل وحدانی ثقافت کا نام نہیں بلکہ کثرت میں وحدت پر مکمل اعتماد رکھنے والا ملک ہے۔ اردو آج بھی اس کے تحفظ و فروغ میں ہزاروں مشکلوں کے باوجود نمایاں رول ادا کررہی ہے۔ اردو نے ہر زبان کو بہ نظر استحسان دیکھا ہے اور ہر قوم کو گلے لگایا ہے۔ ایسے میں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اردو سب کی پیاری زبان ہے۔ کون ہے جو اردو کی زلف گرہ گیر کا اسیر نہیں۔

اردو کے سلسلے میں دوسری بڑی غلط فہمی یہ پیدا کی گئی ہے کہ ''اردو پاکستان کی زبان ہے''۔ جبکہ پاکستان کا ایک بھی صوبہ ایسا نہیں جہاں کے لوگوں کی مادری زبان اردو ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں اردو اپنی اہم قوت کی وجہ سے زندہ ہے اور وہ قوت ہے اس زبان کا رابطے کے طور پر مستعمل ہونا۔ پاکستان میں وہی لوگ اردو کو اپنی مادری زبان بتاتے ہیں جو

لوگ دلی، لکھنؤ، بھوپال یا پٹنہ وغیرہ سے وہاں گئے تھے۔ پاکستان میں تو سندھی، بلوچی، پشتو، سرائیکی اور پنجابی زبانیں ہی زیادہ بولی جاتی ہیں۔ ملک تقسیم ہوا مگر اردو کا بٹوارہ نہ ہوسکا کیونکہ پاکستان میں ہندوستان کا کوئی ایسا صوبہ شامل ہی نہیں ہوسکا جس میں اردو بولی جاتی ہو۔ اردو کے جملہ علاقے ہندوستان میں ہی رہ گئے۔

اردو سے متعلق تیسری غلط فہمی یہ پیدا کی گئی ہے کہ: ''اردو ایک غیر ملکی زبان ہے'' یا ''اردو ہندوستان پر مسلمانوں کے سیاسی غلبے کی نشانی ہے۔'' ایسے میں نئی نسل کو یہ باور کرانا ضروری ہے کہ اردو سیاسی غلبے کی یادگار نہیں بلکہ دو قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے سماجی ملاپ، اتحاد اور گنگا جمنی تہذیب کی یادگار ہے۔ بھارتیندو ہریش چندر نے 1871 میں اپنے ایک سروے میں لکھا تھا کہ اگر والوں کی زبان کھڑی بولی یا اردو ہے اور یہی بات دیگر ہندوؤں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ امریکی سفارت خانے کی طرف سے شائع ہونے والے رسالے ''اسپین'' کے ایڈیٹر اینڈرسن نے گذشتہ دنوں کہا کہ ہندوستان میں 18 سرکاری زبانیں ہیں جن میں ہندی اور اردو سب سے زیادہ بولی جاتی ہیں اس لیے اس امریکن رسالے کا اردو ایڈیشن بھی شروع کیا گیا ہے۔ اگر اردو مسلمانوں کی زبان یا ان کے غلبے کی نشانی ہے تو آنند نرائن ملا نے کیوں کہا تھا کہ: ''میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن اپنی مادری زبان اردو نہیں۔''

اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دینے والوں کے لیے ایک واقعہ تازیانۂ عبرت ہے۔ معروف دانشور اصغر علی انجینئر ایک سروے کے سلسلے میں کیرالہ کے ایک گاؤں میں گئے۔ چونکہ وہ ملیالم نہیں جانتے تھے اس لیے انھوں نے مترجم اپنے ساتھ لیا اور ایک ضعیف العمر عورت کے گھر پہنچے۔ انھیں وہاں کے مسلمانوں کی سماجی حالت وغیرہ سے متعلق اعداد و شمار جمع کرنا تھا۔ عورت نے پوچھا۔ کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟ وہ چپ رہے، جواب مترجم نے دیا۔ عورت نے جتنی بار سوال کیا، مترجم نے ہی جواب دیا۔ عورت نے مترجم سے کہا تو کیوں جواب دیتا ہے، کیا اس کو ملیالم نہیں آتی؟ مترجم نے برجستہ کہا، تبھی تو میں جواب دے رہا ہوں۔ عورت نے کہا۔ ''اللہ یہ ملیالم نہیں جانتا، یہ کیسا مسلمان ہے۔۔۔!''

عرب میں مسلمانوں اور یہودیوں نیز عیسائیوں کی زبان عربی ہے۔ چرچ کے اندر عربی میں خطبے دیے جاتے ہیں۔ رامائن اردو میں بھی ہے، گیتا اور پران بھی۔ زبان کا تعلق مذہب سے نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق اپنے بولنے والوں سے ہی ہوتا ہے۔

اردو کے سلسلے میں ایک تاریخی غلط فہمی یہ ہے کہ آزادی کے بعد سرکاری زبان اردو ہو یا ہندی، اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے باضابطہ ایک انتخاب عمل میں آیا تھا جس میں اردو ایک ووٹ سے ہار گئی تھی۔ رائے شماری دراصل ہندی اور ہندوستانی میں ہوئی جس میں ہندی کو 63% اور ہندوستانی کو 32% ووٹ ملے تھے۔ 1947 کے دنوں میں حالات بہت خراب تھے۔ ایسے میں اردو کو قومی زبان کیا علاقائی حیثیت بھی نہیں دی گئی۔ آلوک رائے کے مطابق جواہر لال نہرو نے ڈرافٹنگ کمیٹی کے ایک رکن ستیہ نارائن سے علاقائی زبانوں کی فہرست بنوائی جس میں اردو شامل نہ تھی۔ اس فہرست میں جواہر لال نہرو نے ''اردو'' اپنے قلم سے لکھا تھا۔ معاملہ جب پارلیمنٹ میں پہنچا تو تیرھویں نمبر پر آئین کے جدول میں مرقوم اردو پر اعتراض ہوا اور آخرش اسی وقت بحث و مباحثے کے بعد اس مقام پر یعنی تیرھویں نمبر پر اردو کو رکھا گیا جب کہ چودھویں نمبر پر سنسکرت کا اضافہ کردیا گیا۔ تاریخ نے جس بے رحمی سے جنگ آزادی میں اہم رول ادا کرنے والی زبان کو تیرھویں نمبر پر لا کھڑا کیا تھا اسی تاریخ نے اس زبان کو بعد میں نہ صرف ہندوستان میں مقبولیت عطا کی بلکہ یہ زبان انگلستان، دوبئی، ابوظہبی، شارجہ، سعودی عرب، مسقط، عمان، افغانستان، کینیڈا، ماریشس، انڈونیشیا، چین، جاپان، جاوا، ساترا میں اپنی چھوٹی سی ہی سہی، جگہ بنانے میں کامیاب ہوئی اور آج ان ممالک میں اردو کی ترقی بڑی تیزی سے ہورہی ہے۔

آج کالجوں اور یونیورسٹیوں میں 1947 سے کہیں زیادہ اردو شعبے قائم ہوچکے ہیں اور طلبہ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ایسے پبلک اسکول بھی کھلے ہیں جہاں اردو ایک مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔

آج یہ خیال بہت سے لوگوں کے ذہن میں گھر کر گیا ہے کہ اردو پڑھنے سے نوکری نہیں ملتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ منظرنامے میں کوئی زبان روزگار کی گارنٹی نہیں دے سکتی۔ کیا اتنا کافی نہیں کہ اردو ہم اپنی تہذیبی ضرورت کے لیے پڑھیں۔ یہ زبان عوامی سطح پر سماج کے ہر فرد کے اجتماعی حافظے اور شعور میں رچی بسی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی مخالفت کرنے والے بھی اردو کے الفاظ اور محاورے استعمال کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ ان کے اسلاف کی زبان بھی اردو رہی ہے۔ اردو ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور سیکولرزم کی سب سے بڑی علم بردار ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے ہندی کا مخالف سمجھنے کی بجائے معاون سمجھا جائے کیونکہ مغرب میں ہندی کو بھی مقبولیت اردو کی وجہ سے ہی ملی ہے۔ لوگ دیوناگری میں چھپی غزلیں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔

ہندوستان میں لگ بھگ 1652 زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے لگ بھگ 1455 زبانیں اور بولیاں ایسی ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد دس ہزار سے بھی کم ہے یعنی 197 زبانیں ایسی ہیں جنھیں بڑے خطوں میں بولی جانے والی زبان کا درجہ حاصل ہے جن میں سے محض 18 زبانوں ہی کو آئین کے آٹھویں جدول میں جگہ ملی ہے۔ ان تمام زبانوں میں محض اردو ہی ایسی زبان ہے جس کا کوئی مخصوص علاقہ یا صوبہ نہیں ہے۔ وہ پورے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی زبان ہے۔ بقیہ ساری زبانیں اگر مذہب کے اعتبار سے نہیں تو علاقے کی سطح پر کسی نہ کسی حد تک محدود ہیں مثلاً بنگلہ بنگال میں، کشمیری کشمیر میں، گجراتی گجرات میں بولی جاتی ہے۔

آج کی نئی نسل کے سامنے اردو زبان کی یہ انفرادیت واضح ہے اور یہ زبان میڈیا کے ذریعے نوجوانوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہی ہے۔ نئی نسل جو اردو زبان سے جذباتی سطح پر وابستہ ہے اس کے نزدیک اردو سے متعلق پیدا کی جانے والی بے بنیاد غلط فہمیوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ نئی نسل بخوبی واقف ہے کہ دنیا کی کوئی بھی زبان محض حکومت کے بل بوتے پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس ضمن میں سنسکرت سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے جو ہندوستان کے اشراف کی زبان تھی۔ دراصل زبانیں اپنی جاذبیت، دلکشی اور نمایاں اوصاف کی بنیادوں پر زندہ رہتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ نئی نسل میں اپنی زبان سے محبت کا جذبہ بیدار کیا جائے۔

اردو تمام تر مشکلات کے باوجود آج ہندوستان کے کئی صوبوں کی سرکاری زبان کا درجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر بھی اردو درس و تدریس کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ ایک تخمینے کے مطابق زبان میں O Level اور A Level میں اردو میں امتحان دینے والے بچوں کی تعداد آٹھ سے نو ہزار تک پہنچ گئی ہے یعنی اردو کی ایک ایسی نئی پود بیرون ملک میں تیار ہو رہی ہے جس کے سبب بیرون ملک میں اردو یونیورسٹی قائم کرنے کی مانگ کی جا رہی ہے۔ امریکہ میں بھی اردو کی صورت حال بہتر ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر (امریکہ) سے ہی اردو کے کم سے کم دس رسالے نکلتے ہیں۔ اس طرح امریکہ، ڈنمارک، ناروے، سعودی عرب اور دیگر خلیجی ممالک میں بسے ہوئے اردوداں طبقے کے بچوں کے لیے اسکول میں اردو پڑھانے کا انتظام ہے۔ عرب میں حج کے موقعے پر بازار میں اردو جاننے والوں کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ نئی نسل کو ان بازاروں میں سیلس مین کے طور پر ملازمت حاصل ہو رہی ہے۔ آج اردو کی بنیاد پر نئی نسل بیرونی ممالک میں استاد کی حیثیت سے کام کر سکتی ہے اور اپنے ملک میں اسے اب معلم کے علاوہ اسکرپٹ رائٹر، نغمہ نگار، اردو آفیسر، ڈائرکٹر، گرافکس، ادارت، اشتہار، نیوز ریڈر، مترجم، پروگرام ایگزیکیٹو اور پروگرام آفیسر جیسے عہدوں پر بھی مل رہی ہے۔

سول سروس کے امتحانات میں کئی سال تک اردو مضمون پڑھنے والے طلبہ اول آئے اور آج بھی طلبہ کی ایک بڑی تعداد اردو کو ایک اختیاری مضمون کے طور پر رکھتی ہے اور انھیں کامیابی بھی حاصل ہو رہی ہے۔ دہلی یونیورسٹی، دہلی لینگویج سیل، اردو گھر، ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد، قومی اردو کونسل، دہلی اردو اکادمی اور ایسے کئی مقامات پر اردو سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کورسوں کا انتظام ہے جہاں مسلم اور ہندو نوجوانوں کی بڑی تعداد اردو سیکھ رہی ہے اور اس طرح ہر سال سیکڑوں اردو پڑھنے والے نوجوان قارئین اور شائقین کا اضافہ ہو رہا ہے۔

ایک سروے کے مطابق اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن کے وہ پروگرام لوگ زیادہ دیکھنا پسند کرتے ہیں، جن کا تعلق اردو زبان و ادب سے ہو یا اردو زبان کی چاشنی اس میں گھلی ہوئی ہو۔ ایک دوسرے سروے کے مطابق غیر سرکاری اداروں میں اردو جاننے والے امیدواروں کو خالص انگریزی جاننے والے کے مقابلے میں زیادہ پسند کیا جاتا ہے کیونکہ عوامی لین دین میں اس زبان کے بغیر کام نہیں چلتا۔ اس بات کا انکشاف بھی ہوا ہے کہ ابتدائی درجات میں ہندی زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان بھی پڑھنے کی خواہش بہت سے طلبہ و طالبات میں پائی جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں اردو اپنی منفرد لسانی جمالیات کی وجہ سے سارک ممالک میں ابلاغ کا وسیلہ بن گئی ہے۔ اردو دنیا بھر میں اپنے اس اہم کردار کی وجہ سے انگریزی کی طرح مشہور ہو رہی ہے۔ نئی نسل کے جن ذہنوں میں اردو میں روزگار کو لے کر کوئی منفی سوچ پیدا ہوئی ہے انھیں یہ ضرور جان لینا چاہیے کہ ہندوستان میں یہ مسئلہ ہندی کے ساتھ بھی ہے۔ البتہ ہندی میں اردو کی بہ نسبت حالات بہتر ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہندی کے مقابلے اردو والے پورے عالم میں بڑے پیمانے پر رسائی حاصل کر چکے ہیں اور وہاں پر اردو کی نئی بستیاں بسا رہے ہیں اور ان بستیوں میں نئی نسل کی ایک ایسی کھیپ موجود ہے جو پچھلی نسلوں سے زیادہ ذہین، محنتی، زیادہ زبانیں جاننے والی، مزید تجربہ کار اور محض اردو پر ہی منحصر نہیں بلکہ اردو کو تہذیبی ضرورت کا مرکز و محور سمجھ رہی ہے۔ اس طرح نئی نسل ایک بار پھر اردو تہذیب کا ایک نیا ایوان تعمیر کرنے کی سمت میں گامزن ہے جو اردو زبان کی ترقی کے لیے ایک نیک شگون ہے۔

Department of Urdu, Dayal Singh College,
New Delhi

□□□

تحریر: سنجے ورما اُدے
ترجمہ: رئیس احمد

چاند ـــــ بعض نئے حقائق

چاند پر رہائش و سکونت اور صنعت کی بات آج بھلے ہی مذاق محسوس ہو، لیکن چاند کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے عالمی سطح پر جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کے تناظر میں اس بات کی صداقت سے قطعاً انکار ممکن نہیں۔

عالمی پیمانے پر 20/جولائی 2069 کو جب چاند پر انسان کی رسائی اور موجودگی کی صد سالہ تقریب منائی جائے گی تب ممکن ہے کہ چاند پر ہو رہے کاروبار اور دیگر مختلف سرگرمیوں سے متعلق خبریں انٹرنیٹ کے مقبول ترین اور قابلِ اعتماد سرچ انجن ''گوگل'' کی جنرل نیوز سروس پر چوبیس گھنٹے مہیا ہوں۔ ''گوگل'' کے مطابق یہ بات موجودہ پس منظر میں بلاشبہ ایک مذاق ہے، لیکن ''گوگل'' نے 26/جولائی سے چاند کے نقشے کی تشکیل کی جو سروس انٹرنیٹ پر فراہم کی ہے اس کی بنا پر چاند سے متعلق عالمی پیمانے پر مزید دلچسپی پیدا ہوگی ہے۔ ''گوگل'' اپنی اس سروس کے ذریعے امریکی خلائی تحقیقی ادارے ناسا کے حوالے سے دستیاب چاند کی زمین اور سطح کی تصویریں پیش کر رہا ہے، علاوہ ازیں چاند پر پہنچے جملہ اپولو خلائی جہازوں کی تصاویر اور چاند پر پہنچنے کی خاص تاریخوں کے علاوہ متعلقہ سائنس دانوں سے متعلق ضروری معلومات بھی اس سائٹ پر فراہم کی جارہی ہیں۔ ''گوگل'' کے منصوبوں میں 2007 میں ایک لونر ریسرچ سینٹر کھولنا بھی شامل ہے۔

چاند کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اور اس کی تصویر کشی کی یہ کوئی پہلی کوشش نہیں ہے۔ 20/جولائی 1969 کو ناسا کے خلائی جہاز اپولو-11 کے ذریعے نیل آرم اسٹرانگ اور ایلڈرن بج، چاند کی سطح پر قدم رکھنے والے جیسے ہی پہلے انسان بنے کہ چاند کو مزید قریب سے جاننے کی خواہش تیز ہوگئی۔ 1969 کے بعد سے 1980 تک جاری لامتناہی خلائی مشنوں میں چاند کے ہر حصے کی جانچ پڑتال کے علاوہ ان کی تصویریں بھی لی گئیں۔ قبل ازیں 1966 میں لونر آربٹر نے چاند کی سطح کا بڑی باریکی سے معائنہ کرکے جو اعداد و شمار فراہم کیے تھے ان کی بنیاد پر تیار کیے گئے نقشے کو آج بھی سب سے اہم تسلیم کیا جاتا ہے۔ جنوری 1998 میں چھوڑے گئے لونر پراسپیکٹر کا مقصد ہی چاند کی بیرونی و اندرونی سطح کے جائزے کے علاوہ اس کے قطبین پر جمی ہوئی برف اور چاند کے مقناطیسی علاقوں کی پختہ معلومات فراہم کرکے ایک قابلِ اعتبار اور مستند نقشہ تیار کرنا تھا۔ تقریباً 18 مہینے تک چاند سے متعلق تمام معلومات یکجا کرنے کے بعد لونر پراسپیکٹر 31/جولائی 2000 کو چاند کے قطب جنوبی کے نزدیک اپنی مہم ختم کرنے کے بعد ایک کیریٹر سے ٹکرا کر فنا ہوگیا، لیکن اس میں ملے مواد اور اعداد کی بنیاد پر چاند پر موجود نہایت اہم حصوں اور عناصر جیسے آکسیجن، لوہا، میگنیشیم، المونیم، شیشہ، یورینیم، تھوریم اور پوٹیشیم وغیرہ سے متعلق تفصیلی معلومات کے علاوہ چاند کی قدیمی اور ابتدائی سطح کی بناوٹ اور وہاں پر پانی کی فراہمی کے امکانات جیسے موضوعات پر مبنی ایک نقشہ تیار کیا گیا تھا، اس نقشے کی تشکیل میں ناسا کے ہی ایک دوسرے خلائی جہاز کلیمینٹائن، نے 71 دن چکر لگا کر چاند کی جو تصویریں اور اعداد و شمار مہیا کرائے تھے ان کا تعاون بھی شامل تھا۔ اس طرح چاند کی ہیئت اور اس کے تشکیلی عمل کے علاوہ اس پر موجود مختلف دھاتوں، اجزا کی مقدار اور تقسیم اور وہاں پر انسانی بستیاں بسانے کے امکانات پر مبنی خاکہ تیار ہوا۔ بلاشبہ آج ہم چاند کو براہ راست اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، زمین پر موجود دوربینوں کی مدد سے اس کا قریب سے معائنہ کر سکتے ہیں۔ ہبل سمیت دیگر خلائی دوربینوں کے ذریعے اس کی چاندی جیسی سطح کا چپہ چپہ چھان سکتے ہیں، لیکن جو تفصیلات لونر مشنوں کے ذریعے خلائی جہازوں میں لگے میپنگ کیمروں کی مدد سے موصول ہوئی ہیں وہ نہایت اہم اور خوبصورت ہیں۔

امریکہ اپنے اپولو خلائی جہازوں کے ذریعے انسان کو چاند پر اتار چکا ہے اور رینجر، کلیمینٹائن، لونر آربٹر اور لونر پراسپیکٹر کی مدد سے اگرچہ چاند کے ہر حصے کو کھنگال چکا ہے لیکن چاند کو چھونے اور اسے مزید بہتر طور پر جاننے کی خواہش ہنوز باقی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے خلائی تحقیقی ادارے اسرو کے مطابق ہندوستان 08-2007 میں چاند کی ازسرنو تلاش و جستجو سے متعلق اپنا خلائی جہاز چندریان۔اوّل فضا میں بھیجنے کے لیے تیار ہے۔ یہ جہاز چاند کے اردگرد محض چکر ہی نہیں لگائے گا بلکہ اس کے ساتھ چاند کی سطح پر اتارا جاسکنے والا ایک امپیکٹر بھی بھیجا جائے گا جو وہاں کی سطح اور زمین کی بناوٹ کا گہرائی سے جائزہ لے گا۔ اس سے قطع نظر امریکہ بھی 2020-2015 کے درمیان چاند پر اپنا خلائی جہاز مع انسان بھیجنے کا اعلان کر چکا ہے۔ چین اور جاپان جیسے ممالک بھی

خلائی بازار کے امکانات کے مدنظر مشن چاند کے منصوبے پر تیزی سے کام کر رہے ہیں۔ چاند پر نیا مشن بھیجنے کے لیے جو دلیلیں پیش کی جارہی ہیں ان کے مطابق میزائل حفاظتی منصوبہ، فاصلاتی خلائی مشنوں اور چاند پر معدنیات کے امکانات تلاش کرنے کے پیش نظر یہ چاند مشن بے حد ضروری ہے۔

جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے تو اس سے ہندوستانی خلائی پروگرام کو ایک نئی بلندی مل سکتی ہے اور خلا میں مصنوعی طیارے بھیجنے کے بین الاقوامی بازار میں اس کی اہمیت چار گنا زیادہ بڑھ جائے گی۔ چین او رجاپان کی کوششوں کا مقصد بھی تقریباً یہی ہے۔

ایک دلیل یہ بھی ہے کہ 1969 سے 1972 کے درمیان چھ اپولو مشنوں سے امریکہ چاند کی زمین اور سطح سے متعلق اس کے خط استوا کے اردگرد بہت ہی معمولی معلومات حاصل کرسکا تھا، بعدازاں 1994 میں کلیمینٹائن اور 1998 میں لونر پراسپیکٹر نامی دو خلائی جہاز چاند پر بھیج کر امریکہ نے چاند کی سطح پر برف ہونے کا قیاس لگایا تھا۔ مستقبل میں کیے جانے والے چاند مشنوں سے دنیا کو چاند کی بناوٹ، مقناطیسی قوت اور کشش ثقل کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم ہوسکتی ہیں۔ ان معلومات کا استعمال کائنات میں خلائی جہازوں کے طویل سفر کے ضمن میں چاند پر مستقل قیام کے مقصد سے ہوسکتا ہے۔

چاند پر شیشہ، المونیم، کیلشیم، میگنیشیم اور سلیکون جیسے اجزا کافی مقدار میں ہیں۔ چاند کی مٹی اور چٹانوں میں ہیلیم-3 کے بڑے خزانے پوشیدہ ہیں۔ پانی کی قلت کے مسائل اور ان کے حل کے علاوہ توانائی کے متبادل ذرائع تلاش کرنے کے لحاظ سے بھی چاند لامحدود امیدوں اور امکانات کا مرکز ومحور ہے۔

عالمی وراثت ــــ چاند

آج سے 36 سال قبل جب پانی بھرے کٹورے میں چاندی جیسے چمکتے سیارے کو اپنے قریب پاکر خوش ہونے کے تصور سے باہر نکل کر انسان نے چاند پر اپنے قدموں کے نقش چھوڑے تھے، تقریباً اسی وقت یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ کیا زمین پر بسنے والوں کے لیے چاند ایک متبادل ہوسکتا ہے، بعدازاں چاند کو طویل خلائی سفروں کے درمیان بہتر قیام اور معدنیات کی غرض سے بھی چاند کی سطح کو استعمال کرنے کے بارے میں غور کیا جانے لگا۔ ان امکانات کو حقیقت کا جامہ پہنانا آج کے تناظر میں ایک خواب ضرور ہے لیکن ان سوالات نے دنیا کو دو خیموں میں تقسیم کردیا ہے۔ ایک خیمے کے مطابق چاند کو صنعتی کارگزاریوں سے دور رکھتے ہوئے بطور عالمی وراثت محفوظ رکھا جائے اور انٹارکٹکا کی طرح وہاں صرف پرامن اور سائنسی سرگرمیوں کی ہی اجازت دی جائے۔ یہ خیمہ اقوام متحدہ سے ایک ایسا نظام بنانے کی درخواست کررہا ہے جو پورے عالم کو انٹارکٹکا معاہدے کی طرح منظور ہو۔ دوسرا خیمہ (مون سوسائٹی) جس میں خلائی سائنس داں، کمپیوٹر سائنس داں اور دیگر سائنسی ماہرین شامل ہیں، چاند کی سطح کے صنعتی استعمال کے حق میں ہیں۔ چاند کے صنعتی استعمال کا یہ خیال سب سے پہلے کس کے ذہن میں آیا ہوگا اس ضمن میں کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس خیال نے مختلف ممالک میں راتوں رات ایسی کمپنیوں کی ایک فوج کھڑی کردی ہے جو چاند پر گولف کورس سے لے کر دس منزلہ عمارت بنانے اور چاند کے حصوں کی فروخت کا منصوبہ بنانے لگیں۔

جاپان کی شمِزو کنسٹرکشن کمپنی، لونر ٹینس کورٹ اور گولف کورس بنانے کی خواہاں ہیں تو نشاتسو کمپنی وہاں کئی منزلہ عمارت بنانے میں دلچسپی رکھتی ہے، اسی طرح یونیورسل لونر سوسائٹی کا خواب چاند پر لونار یہ نامی پورا شہر بسانا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ چاند کی سطح کے ٹکڑوں کی آن لائن فروخت ممکن ہے۔ اگر آپ چاہیں تو مون اسٹیٹس ڈاٹ کام نامی سائٹ پر جاکر اپنا آرڈر بک کرسکتے ہیں اور مال پسند نہ آنے پر رقم واپسی کی بھی گارنٹی ہے۔ سعلو ے نامی سوپر مارکیٹ بھی مون اسٹیٹس کی راہ پر گامزن ہے اور قریب 16 پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے چاند کے ٹکڑے فراہم کرانے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اسی پس منظر میں ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ امریکہ، کناڈا اور برطانیہ میں 1998 میں کرائے گئے ایک سروے کے مطابق 92 فیصد لوگوں کے نزدیک چاند کے صنعتی استعمال میں کوئی برائی نہیں۔ (بہ شکریہ روزنامہ "ہندوستان" نئی دہلی، 4 راگست 2005)

ابتدائی اردو

مرتبین: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ، مجسم تقی

اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ اردو کے طلبہ کو معیاری اردو بولنا، پڑھنا اور لکھنا آجائے۔ کتاب کی تیاری میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ زبان معیاری مگر عام فہم اور آسان ہو۔ جو مشکل لفظ آگئے ہیں، ان کے معنی ہندی اور انگریزی میں دے دیے گئے ہیں۔

صفحات: 97، قیمت: -/24 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

غلام نبی مومن

بابا آمٹے — ایک مثالی شخصیت

بابا آمٹے ضلع وردھا کے تعلقہ ہنگن گھاٹ (مہاراشٹر) میں 26 دسمبر 1914 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد سرکاری ملازم تھے۔ وہ کافی دولت مند تھے۔ اس لیے بابا آمٹے کا بچپن بڑے ناز ونعم میں گزرا۔ وہ اپنے والد سے بہت ڈرتے لیکن ماں سے بہت قریب تھے۔ بچپن میں ماں نے انھیں کھیلنے کے لیے کٹھ پتلیاں بنادی تھیں جو گرنے پر خود بخود اٹھ جایا کرتی تھیں۔ اس پر ماں نے کہا تھا ''اسی طرح زندگی میں جب تمھیں شکست ہو تو ڈرنا مت اور کسی سے مدد لینے کی بھی ضرورت نہیں۔ جیت ہار تو قسمت سے ہے، انسان کو بس لڑتے رہنا چاہیے، یہی زندگی ہے۔'' ایک دفعہ دیوالی کے موقعے پر ان کے والد نے انھیں اور ان کے چھوٹے بھائی مدھو، کو پٹاخے خریدنے کے لیے پانچ پانچ روپے کی ریزگاری دی اور ایک نوکر کو بھی ساتھ کیا۔ مدھو نے ان روپیوں سے طرح طرح کی آتش بازیاں خریدیں لیکن بابا نے وہ سارے پیسے ایک بھکاری کے کشکول میں ڈال دیا۔ سکوں کی کھنک سن کر بھکاری کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ دیکھ کر بابا کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

بابا آمٹے ڈاکٹر بننا چاہتے تھے لیکن والد نے ان کا داخلہ بی.اے. میں کروادیا۔ اس زمانے میں وہ ناگپور میں سول لائنس کے امیر ترین علاقے میں رہتے تھے۔ انھیں انگریزی فیشن کے کپڑے پہننے، انگریزی فلمیں دیکھنے اور شکار کھیلنے کا شوق تھا۔ اسپورٹس کار میں کالج جایا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں وہ آزادی کے متوالے مسلح انقلابیوں سے متاثر ہوئے۔ ان کے ہتھیار چھپانے اور پیغامات پہنچانے میں تعاون کرنے لگے۔ ان تمام مصروفیتوں کے باوجود محنت سے پڑھتے اور ہر امتحان میں کامیاب ہوتے تھے۔ بی.اے. کے بعد انھوں نے وکالت کی ڈگری حاصل کی۔ والد کے کہنے پر چھتیس گڑھ کے علاقے میں وشوناتھ راؤ تامسکر کے ساتھ کام کرنے لگے جو دیش بھگت اور مشہور فوجداری وکیل تھے۔ گنہگاروں کو آزاد کرانے میں اپنی ذہانت کو صرف کرنا بابا کو ناگوار گزرتا تھا۔ آخر کار 1940 میں وہ بردوہ آگئے۔ یہاں کرائے کا ایک مکان لے کر رہنے لگے اور وکالت کے ساتھ ساتھ کھیتی باڑی بھی شروع کردی۔

1936 میں مہاتما گاندھی ضلع وردھا میں سیوا گرام کے مقام پر آکر رہنے لگے تھے۔ اسی دوران بابا آمٹے گاندھی جی کے خیالات سے متاثر ہوئے اور ملک وقوم کی خدمت کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے پسماندہ ذات وطبقات کی فلاح وبہبود کے لیے امداد باہمی کی بعض انجمنیں بنائیں اور غریبوں کی قانونی مدد بھی کرنے لگے۔ اس طرح زندگی کا مقصد بدلا تو رہن سہن بھی بدل گیا۔ سوٹ بوٹ اور ٹائی چھوڑ کر کھادی کے کپڑے پہننے لگے۔

اسی دوران ایک عجیب واقعہ یہ پیش آیا کہ سفر کے دوران ریلوے کے ایک ڈبے میں ایک گورے سپاہی نے ایک نئی نویلی دلہن کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی اور بابا سے یہ بے عزتی برداشت نہیں ہوئی، وہ سپاہی پر ٹوٹ پڑے، زخمی ہونے کے باوجود لڑکی کو چھڑالیا۔ گاندھی جی نے یہ خبر سنی تو ان کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ ہمارے دیش کو ایسے ہی جوانوں کی ضرورت ہے۔

بابا آمٹے نے ''بھارت چھوڑو'' تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، انھیں اکیس دن کی سزا ہوگئی۔ اس کے بعد وہ گاندھی جی کے سچے ستیہ گرہی کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ آخر کار ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ بھوکوں اور پریشان حال لوگوں کی مدد کرنا ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ ان کا دل خدمت خلق کی جانب راغب ہوگیا۔

18 دسمبر 1946 کو اندو گھلے کے ساتھ انکی شادی ہوگئی۔ شادی میں انھوں نے کوئی جہیز نہیں لیا۔ اندو تائی بھی بابا کے ساتھ خدمت خلق میں لگ گئیں۔ لوگ انھیں سادھنا تائی کہنے لگے۔ بابا سے ملنے کے لیے بھی برادری اور طبقے کے لوگ آیا کرتے تھے۔ انھوں نے تمام ذات برادری کے لوگوں کو لے کر ایک ساتھ رہنے کا تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے مکان مالک کو یہ بات پسند نہیں آئی اور انھیں مکان خالی کرنا پڑا۔ اس وقت کے مدھیہ پردیش کے ایک وزیر جناب آر.کے. پاٹل نے اپنی سات ایکٹر زمین دے کر بابا کی مدد کی اور بابا نے اسی زمین پر ''شرم آشرم'' قائم کیا۔

چونکہ بابا ذات پات کے بھید بھاؤ کو نہیں مانتے تھے اس لیے ان کے رشتے دار ناراض ہوگئے۔ انھوں نے موروثی جائیداد پر اپنا حق چھوڑ دیا تھا اور کمائی کا کوئی دوسرا ذریعہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ گاندھی جی اور ونوبا بھاوے کی کتابیں اور گاؤں میں تیار کی گئی مختلف چیزیں فروخت کرنے لگے۔ اتنی محنت کرنے کے بعد بھی کچھ زیادہ آمدنی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ ونوبا بھاوے کے پاس گئے تو ونوبا جی نے ان کی ہمت بڑھائی۔

بابا آمٹے وکالت کرتے ہوئے گاؤں کی صفائی، سڑکوں پر جھاڑو دینے، ہریجنوں کی تنظیم بنانے اور محنت کش طبقے کے لیے امداد باہمی کا کام بھی کرتے

تھے۔ ایک بار صفائی مزدوروں نے ہڑتال کر دی تھی۔ بارش کا موسم تھا۔ وہ فضلہ پھینکنے کے لیے گئے تو انھیں کچرے کے ڈھیر میں کوئی چیز حرکت کرتی دکھائی دی۔ قریب جا کر دیکھا تو وہ ایک جذامی تھا جس کے بدن کے اعضا سڑگل گئے تھے۔ بابا یہ منظر دیکھ کر بے چین ہو گئے۔ رات بھر تڑپتے رہے۔ صبح ہوتے ہی اسے دیکھنے جا پہنچے۔ وہ مر چکا تھا۔ اس حادثے نے انھیں بہت زیادہ جذباتی بنا دیا تھا اور اسی حادثے کے بعد سے انھوں نے تا حیات جذامیوں کی خدمت کو اپنا شعار بنالیا۔

کام شروع کرنے سے پہلے انھوں نے جذام کی پوری معلومات اور تربیت حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ اس لیے پہلے دت پور کا ''کشٹھ دھام'' اور امراوتی میں ڈاکٹر شیواجی راؤ پٹوردھن کے 'تپوون'' کا مشاہدہ کیا۔ کلکتہ کے ایک کالج سے تربیت حاصل کی۔ ماہر جذام ڈاکٹر واردیکر سے دوستی کی۔ فادر ڈیمین نے جذامیوں کے لیے جو خدمات انجام دی تھیں ان کی معلومات حاصل کیں اور اس کے بعد وہ جذامیوں کے علاج معالجے اور بازآبادکاری کے کام میں جٹ گئے۔

1951 میں بابا کو وروڑہ کے قریب سرکاری زمین مل گئی۔ یہیں انھوں نے جذامیوں کے لیے ایک بستی بسائی۔ ان کے ساتھ مل کر کنواں کھودا، جنگل صاف کیا، زمین کو کھیتی کے لیے تیار کیا۔ اس سے مریضوں میں جینے کا حوصلہ اور خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ سب لوگوں کی مشترکہ محنت سے ہری بھری کھیتیاں لہلہانے لگیں، سبزی ترکاریوں کی کیاریاں تیار ہو گئیں، پھولوں کے پودے اور پھل دار درخت اگائے گئے، جھونپڑے بنائے گئے۔ مریضوں کے چہرے پر پھیلی ہوئی خوشی دیکھ کر بابا نے اس جگہ کا نام '' آنندبن'' رکھا۔ بابا نے جذامیوں کی نہ صرف خدمت کی بلکہ انھیں خاندان بھی فراہم کیا اور سماج میں انسانوں کی طرح رہنے کے قابل بنایا۔ اسی مقام پر انھوں نے یتیم بچوں کے لیے ''گوکل'' قائم کیا۔ سادھنا تائی ہی ان بچوں کی ماں تھیں۔ سادھنا تائی کی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے انھیں '' دلت متر'' کے خطاب سے نوازا۔ اس آشرم کی ہر چیز سب کے لیے ہوتی ہے۔ ان کے دونوں بیٹوں، بہوؤں اوران کی اولاد کے لیے بھی یہی اصول ہے۔

بابا آمٹے جذامیوں کی اس طرح خدمت کرتے ہیں کہ ان کے دل بھی صحت مند ہو جاتے ہیں۔ ان کے علاج کا ڈھنگ ایسا ہے کہ ہر اچھا ہونے والا مریض خود ہی دوسرے مریضوں کی خدمت کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے بابا کو یہاں تنخواہ دار ملازم رکھنے کی کبھی بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔

حکومت مہاراشٹر کی مالی امداد سے بابا نے 1957 میں ناگپور کے قریب 120 ایکڑ زمین خرید کر ایک نئی بستی ''اشوک بن'' بسائی۔ یہاں بھی دواخانہ، رہائشی مکانات اور مویشیوں کا گوٹھا تعمیر کیا گیا۔ آنندبن نے دھیرے دھیرے خوب ترقی کی۔ شفایاب مریضوں نے 1964 میں '' آنندنکیتن کالج'' کی عمارت تعمیر کر کے سماج کو سپرد کی۔ اب یہاں سائنس، کامرس اور زراعت کی تعلیم دی جارہی ہے۔

1966 میں ریڈرس ڈائجسٹ کی جانب سے معذوروں کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے کاؤنٹ تارکوسکی آنندبن آیا تھا۔ وہ خود معذور تھا جو وہیل چیئر پر سفر کرتا تھا۔ آنندبن میں گوکل، جذامیوں کے بچوں کے لیے پرائمری اسکول، گونگے، بہرے اور اندھوں کے لیے تربیتی ادارہ، آنندنکیتن کالج اور امداد باہمی کو دیکھ کر وہ بابا کے کاموں سے بہت متاثر ہوا۔

آہستہ آہستہ بابا کے کاموں کی شہرت عام ہوتی گئی اور انھیں مختلف افراد اور اداروں کی جانب سے مالی امداد ملنے لگی۔ اس رقم سے انھوں نے کئی عمارتیں تعمیر کروائیں۔ جن مریضوں نے شادی کر لی تھی ان کے رہنے کے لیے کمرے، تقریبات منانے کے لیے ہال، اندھے، بہرے، گونگے طلبہ کے لیے ہوسٹل، معذوروں کے لیے رہائشی کمرے تعمیر کیے۔ دنیا کے مختلف ممالک کے پچاس نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا ایک گروپ ''شرم دان'' کے لیے آنندبن آیا تھا۔ اس گروپ نے تین مہینے کے قلیل عرصے میں دو پختہ عمارتیں تعمیر کر دیں۔ بابا نے یہاں ایک پریس بھی لگا لیا ہے۔ سوئٹزر لینڈ کی مالی امداد سے اب یہاں مختلف قسم کی اشیا جیسے ڈبے، چھلنی، قندیل وغیرہ تیار کر کے فروخت کی جاتی ہیں جو آمدنی کا ایک ذریعہ ہے۔ علاوہ ازیں یہاں پر کئی زرعی آلات بنائے گئے ہیں۔

بابا آمٹے نے جذامیوں کی بازآبادکاری کے ساتھ ساتھ آدی باسیوں کی فلاح و بہبود کے لیے بھی کافی کام کیا۔ مہاراشٹر میں چندر پور اور گڈ چرولی کے اضلاع انتہائی پسماندہ ہیں۔ یہاں بھیل، گونڈ، بلہا وغیرہ آدی باسی آباد ہیں۔ یہ آدی باسی بہت غریب، توہم پرست اور نشے کے عادی ہیں۔ ہیمل کسا گاؤں کے آدی باسیوں کی حالت بہت خراب ہے۔ بابا نے ان کی حالت سدھارنے کے لیے ایک اسکیم بنائی جس میں زراعت، صحت اور تعلیم پر زور دیا گیا۔ اس اسکیم پر عمل درآمد کرنے والے وہ نوجوان ہیں جو بابا کے کاموں سے متاثر ہیں۔ اس کام میں بابا کو جذامیوں اور معذوروں کا عملی تعاون حاصل ہے۔ بابا کے لڑکے ڈاکٹر پرکاش نے یہاں دواخانہ کھولا ہے جس سے آس پاس کے تقریباً بیس دیہات مستفیض ہو رہے ہیں۔ یہاں پر بھی مریضوں اور کام کرنے والوں کے لیے کمرے تعمیر کیے گئے ہیں۔ بابا آمٹے آدی باسی شاگردوں کو کھیتی باڑی کرنے، باغات لگانے، سبزی ترکاری اگانے اور حفظان

صحت کی تعلیم و تربیت دیتے ہیں۔ نتیجتاً آج ان میں سے کئی ڈاکٹر اور معلم بننے کے علاوہ پولیس کی نوکریوں میں بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں بعض دست کاری کے کاموں میں مصروف ہیں۔

ہیمل کسا اسکیم کا ایک پہلو بچوں کی اموات کی روک تھام اور ملیریا کا خاتمہ کرنا ہے۔ دوردراز کے علاقوں میں پرائمری ہیلتھ سینٹر کھولے گئے ہیں۔ یہاں کئی لوگ خدمت کے جذبے کے تحت کام کررہے ہیں۔ جو آدی باسی دواخانے میں آنا پسند نہیں کرتے ان کا علاج ان کے گھر جاکر کیا جاتا ہے۔ ایسے مریضوں کو دیکھنے کے لیے ڈاکٹر پرکاش کو کبھی کبھی دس دس میل پیدل چلنا پڑتا ہے۔

بابا آمٹے نظریاتی اعتبار سے گاندھی جی سے متاثر ہیں۔ اس لیے انھوں نے ملک میں پھیلی ہوئی نفرت کی آگ کو بجھانے اور قومی یکجہتی کو مستحکم کرنے کے لیے 1986 میں ''بھارت جوڑو یاترا'' شروع کی۔ یہ یاترا ایک سو سات دنوں میں پوری ہوئی۔ اس یاترا میں ذات پات، نسل، زبان، دھرم کا بھید بھاؤ بھول کر نوجوان شریک ہوئے۔ پنجاب میں تشدد کو روکنے کے لیے انھوں نے شانتی یاترا کی اور اہنسا کا پیغام دیا۔

بابا کو انسانیت سے پیار ہے۔ وہ آدمی کو انسان بنانا چاہتے ہیں اور اس ہنر سے خوب واقف ہیں۔ انھوں نے جذامیوں کو نئی زندگی دی، انھیں جینا سکھایا۔ وہ جذامیوں سے کہا کرتے ہیں ''جو اعضا سڑگل گئے ہیں ان کا افسوس نہ کرو، جو ثابت ہیں ان کی مدد سے کام کرنا سیکھو۔'' بابا خود بھی نڈر ہیں اور ان کے ساتھ رہنے والا بھی نڈر بن جاتا ہے جیسے ان کے بیٹے، بہو، ان کی اولادیں اور ان کے ساتھ کام کرنے والے دیگر رفقا۔ بابا دھن کے پکے ہیں۔ جس کام کو کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں اسے پورا کرتے ہیں۔ ان کے سینے میں ایک حساس دل ہے جو دوسروں کے دکھ درد پر تڑپ اٹھتا ہے اور یہ تڑپ کبھی کبھی کسی خوبصورت نظم کا روپ اختیار کرلیتی ہے۔ بابا نے مراٹھی زبان میں کئی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی ہر نظم خود اعتمادی اور امید کا پیغام دیتی ہے اور انسانوں کو نئی راہ دکھاتی ہے موصوف کی خدمات کا ہر سطح پر اعتراف کیا گیا ہے۔ انھیں اب تک بین الاقوامی، قومی اور ریاستی سطح کے کئی انعامات و اعزازات اور خطابات سے نوازا گیا ہے۔ بابا نے انعام میں ملی ہوئی تمام پونجی آنند بن اور ضرورت مندوں کے لیے وقف کردی۔ حال ہی میں حکومت مہاراشٹر کی جانب سے انھیں ''مہاراشٹر بھوشن'' کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔

Special Officer for Urdu,
M.S. Bureau of Text Books,
Balbharati Senapati Bapat Marg,
Pune-411004.(Maharashtra)

○○○

مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی تب و تاب عطا کی اور ایک منفرد لب و لہجے سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہوسکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کے حالاتِ زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلام دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ذریعے اس تشنگی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 592، قیمت: -/258 روپے

کلیاتِ علی سردار جعفری (جلد اول)

مرتب: علی احمد فاطمی

علی سردار جعفری ایک شاعر، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، صحافی، نقاد، مفکر اور دانشور ہی نہیں ادب، تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے گہرے رمز شناس بھی تھے۔ کونسل نے ان کی تمام تحریروں کو کلیات کی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں کلیاتِ علی سردار جعفری کی پہلی جلد حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس میں ان کے مجموعہ ہائے کلام ''پرواز''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''خون کی لکیر'' اور ''امن کا ستارہ'' شامل ہیں۔

صفحات: 496، قیمت: -/164 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے %40 کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

بھرت جھن جھن والا

ویٹ کا غلط استعمال

دنیا کے تقریباً 125 ممالک میں ویٹ (ویلیو ایڈڈ ٹیکس) نافذ ہے۔ کسی مال کی پہلی فروخت پر محصول (سیل ٹیکس) ادا کیا جاتا ہے۔ مال پر ایک بار محصول ادا کرنے کے بعد اس پر دوبارہ محصول نہیں دینا ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کہ کسی فیکٹری نے 20 روپے فی کلو کی شرح سے کاغذ بیچا اور اس پر 12.5 فیصد کی شرح سے محصول ادا کر دیا، دکاندار نے اسی کاغذ کو 30 روپے میں خریدار کو بیچا۔ موجودہ صورت میں دکاندار کو 30 روپے کے فروخت پر محصول ادا نہیں کرنا ہوتا ہے کیونکہ اس نے محصول ادا کیا ہوا مال خریدا تھا۔ ویٹ کے تحت دکاندار کو 30 روپے کی فروخت پر 12.5 فیصد کی شرح سے ویٹ ادا کرنا ہوگا اور اسے خرید پر ادا کیے گئے ویٹ کی رقم واپس مل جائے گی۔ ویٹ نظام میں 30 روپے کے کاغذ کی فروخت پر دوبار محصول ادا کیا جائے گا۔ مال بنانے والی فیکٹری کے ذریعے 20 روپے پر اور دکاندار کے ذریعے ویلیو ایڈڈ 10 روپے پر۔

پہلی فروخت پر محصول وصول کرنے سے اقتصادیات میں خرابی پیدا ہوتی ہے، جس مال کو کئی بار بیچا جاتا ہے اس پر کل محصول کا کم سے کم عائد ہوتا ہے۔ اگر کاغذ کی ایک ریم 4-3 دکانداروں کے بعد صارف کو 60 روپے فی کلو میں فروخت کی گئی تو اس پر محصول صرف 20 روپے کی پہلی فروخت پر وصول کیا جاتا ہے۔ اس عدم توازن سے محصولات میں کمی آتی ہے جس کی تلافی کرنے کے لیے سرکار کو اس کی شرح بڑھانی پڑتی ہے جس کے سبب ٹیکس کی چوری بڑھتی ہے۔ ویٹ نظام میں جیسے جیسے مال کی قیمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے ٹیکس بھی ہر قدم پر ادا کرنا ہوتا ہے، جس سے ویٹ کی شرح سیل ٹیکس سے عموماً کم ہوتی ہے۔

ویٹ نظام کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس میں شرحوں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ ویٹ آج کل تقریباً 125 ممالک میں نافذ ہے۔ ان میں تقریباً 70 ممالک میں ویٹ کی یکساں شرح ہے جس کے سبب درجہ بندی کے تمام مسائل ختم ہو جاتے ہیں، مگر یکساں شرح کی افادیت مشکوک ہے۔ یکساں شرح ہونے سے محصول دینا آسان ہو جاتا ہے اور اقتصادیات کو رفتار ملتی ہے۔ ساتھ ہی ٹیکس پالیسی کا سماجی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال متاثر ہوتا ہے۔ ایک شرح سے ویٹ لگانے سے سگریٹ اور ہری سبزی، فحش فلم اور مذہبی سیریل وغیرہ پر ایک ہی شرح سے محصول لگتا ہے جو کہ مناسب نہیں ہے۔ ٹیکس نظام ایسا ہونا چاہیے جو کہ حکومت کے لیے محصولات بھی اکٹھی کرے اور خوبصورت سماج کی تشکیل بھی کرے۔ اس نقطۂ نظر سے ملک میں لگائے جا رہے ویٹ میں دو مجوزہ شرحیں ٹھیک ہیں۔ 4 فیصد اور 12.5 فیصد۔ چند اچھی اشیا پر 4 فیصد شرح سے ٹیکس لگایا گیا ہے جب کہ باقی سبھی اشیا پر 12.5 فیصد اگرچہ ٹیکس کی دو شرحیں ہونے کے سبب ویٹ کے سسٹم کی آسانی اور شفافیت کچھ متاثر ہوتی ہے، مگر اس اعتراض کو سماجی مقاصد کے سبب قبول نہیں کیا جا سکتا۔

ویٹ کی مخالفت میں دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ یہ ریاستوں کی خودمختاری پر مرکز کے ذریعے دخل اندازی ہے۔ آئین میں محصول فروخت کو ریاست کے اختیار میں رکھا گیا ہے۔ مرکز کے ذریعے ویٹ کا یکساں نظام نافذ کرنے کا دباؤ بنانا ریاست کے اختیار کو محدود کرتا ہے مگر یہ دلیل ویٹ کے خلاف نہیں ہے۔ ریاستوں کو چھوٹ ہے کہ وہ اپنی سہولتوں کے مطابق ویٹ نافذ کر سکتی ہیں۔ ریاستوں کے مفاد میں ہے کہ اپنے محصولاتی نظام کو دوسری ریاستوں کی طرح سہل بنائیں۔ ہر ریاست کے لیے ضروری ہے کہ نجی سرمایہ کاروں کو متوجہ کرے۔ اس کے لیے سہل اور یکساں محصولاتی نظام مناسب ہے۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یکساں محصولاتی نظام اور ریاستوں کی خودمختاری میں باہم تضاد ہے۔ اس لیے ریاستوں کو چھوٹ ہونی چاہیے کہ اپنی سہولت کے مطابق مختلف طرح کے مال پر الگ الگ شرح سے ویٹ لگا سکیں۔ یہ چھوٹ ویٹ نظام میں موجود ہے۔ ہر ریاست کو چھوٹ ہے کہ اپنی سہولت کے مطابق مختلف طرح کے مال پر 4 فیصد یا 12.5 فیصد کی شرح سے ویٹ لگائے۔ ممکن ہے کہ جھارکھنڈ میں کاغذ پر 4 فیصد کا ویٹ لگایا جائے اور مغربی بنگال میں 12.5 فیصد۔ اس لیے ویٹ نظام میں ریاست کی خودمختاری کی سمت ضرور طے ہو جاتی ہے مگر خودمختاری برقرار رہتی ہے۔

ہریانہ میں دو سال قبل ویٹ نافذ کیا جا چکا ہے۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک فنانس اینڈ پالیسی کی ڈاکٹر کویتا راؤ کے مطابق ان دو برسوں میں حکومت ہریانہ کی محصولات میں 50 فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ ویٹ لگانے کے بعد محصولات میں اضافہ ہوتا ہے کیوں کہ آخری فروخت پر محصول وصول کیا جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ اشیا کی قیمت میں بھی گراوٹ آ سکتی ہے۔ سبب یہ ہے کہ ویٹ کے مقابلے میں محصول فروخت کی شرحیں اونچی ہوتی ہیں۔ پہلی فروخت پر 20 فیصد محصول لگانا پڑتا ہے جب کہ اتنی ہی محصولات یکجا کرنے کے لیے 12.5 فیصد ویٹ کافی ہو سکتا ہے۔ ویٹ کی شرح کم ہونے سے محصول کی چوری کم ہوتی ہے۔

ویٹ سے متعلق قابل غور بات یہ ہے کہ حکومت جن اضافی محصولات کو یکجا کرنا چاہتی ہے وہ ملک کے لیے مفید مطلب ہیں یا نہیں۔ موجودہ ماحول میں سرکاری ملازمین، اساتذہ اور فلاحی ریاست کی ناکام ہو چکی اسکیموں جیسے روزگار گارنٹی اسکیم پر سرکاری خرچ بڑھایا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ محصولات کا اضافہ ضائع ہوگا۔ حکومت کو پہلے اپنے خرچ کے معیار میں اصلاح کرنی چاہیے اس کے بعد محصولات بڑھانی چاہیے۔ ویٹ کا استعمال سرکاری فضول خرچی کو بڑھاوا دینے کے لیے کرنا اسی طرح ہے جیسے ٹیوب ویل کے پانی سے دھتورا اگانا۔

732, Modern Society, Sector 15, Rohini,
Post Box 10754, Delhi-110085

کونسل کی بعض اہم کتابوں پر غیر معمولی رعایت

2005 کا سال اردو ادب میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار پریم چند کی 125 ویں سالگرہ کا سال ہے۔ بیسویں صدی میں برصغیر کے سب سے بڑے شاعر اقبال کے کلام کی باقاعدہ اشاعت بھی 1905 سے شمار کی جاتی ہے اور اس سال ان کی شاعری میں ایک نیا موڑ بھی آیا۔ اردو کے کلاسیکی شعرا میں آخری بڑا نام نواب مرزا خاں داغ دہلوی کا ہے۔ 2005 میں ان کے انتقال کو بھی سو سال ہو جائیں گے۔ 2005 اس لیے بھی اہم ہے کہ ہمارے ترقی پسند ادب کے اہم ترین معمار سجاد ظہیر کی پیدائش کو بھی 2005 میں سو سال ہو جائیں گے۔ مشہور ترقی پسند افسانہ نگار اور مارکسی مفکر ڈاکٹر رشید جہاں کی پیدائش کے بھی سو سال اسی سال مکمل ہوں گے۔

سال 2005 کی مندرجۂ بالا اہمیت کے پیش نظر یہ طے کیا گیا ہے کہ کونسل کی مندرجۂ ذیل اہم مطبوعات کو ہم 75% فیصد رعایت پر شائقین کو فراہم کریں گے یعنی جو کتاب 100 روپے کی ہے وہ 25 روپے میں حاصل ہو سکے گی۔ محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمے ہوگا۔

جو کتابیں کئی جلدوں میں ہیں ان کی کوئی جلد الگ سے فروخت نہ کی جا سکے گی۔ لیکن ہم پریم چند کی 125 ویں سالگرہ کے موقعے پر کلیات پریم چند کی متفرق جلدیں اس موقعے پر بے تکلف مہیا کر سکیں گے۔ کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے۔

جامع انگریزی اردو لغت

مرتب: کلیم الدین احمد

محققین، مترجمین، دفتری اہل کاروں، اساتذہ، قانون دانوں، اہل علم و قلم، صحافیوں، طلبہ اور عام لوگوں کی روزمرّہ ضروریات کے لیے یکساں افادیت کی حامل یہ انگریزی اردو لغت ڈھائی لاکھ سے زائد الفاظ و اصطلاحات و معانی کا احاطہ کرتی ہے۔ مترادفات، محاورات اور تشریحات سے مزین اپنی نوعیت کی یہ پہلی مستند، وقیع اور ضخیم لغت ویبسٹر کو بنیاد بنا کر تیار کی گئی ہے۔

قیمت: مکمل سیٹ -/3400 روپے

نور اللغات

انیس فاروقی

یہ مولوی نور الحسن نیر کاکوروی کی تالیف کردہ اردو کی مشہور اور مستند لغت ہے جو چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ اہم لغت مدت سے نایاب تھی، اردو کونسل نے عام استفادے کے لیے اسے دوبارہ شائع کرایا ہے۔

قیمت: (مکمل سیٹ) -/1095 روپے

فرہنگِ آصفیہ

سید احمد دہلوی

یہ اردو زبان کا وہ مشہور اور مستند لغت ہے جو برسوں سے نایاب تھا۔ اس لغت میں عربی، فارسی، ترکی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی کے وہ تمام الفاظ شامل ہیں جو اردو زبان کا جزو بن چکے ہیں۔

قیمت: (مکمل تین جلدیں) 750 روپے

جامع اردو انسائیکلوپیڈیا

کونسل نے اردو میں پہلا مکمل اور بین الاقوامی معیار کا انسائیکلوپیڈیا شائع کیا ہے۔ اس کا سارا مواد بڑی دیدہ ریزی اور مشقت کے ساتھ سلیس زبان اور دلنشیں پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایسی کاوش ہے جو آئندہ کئی نسلوں کو علم و دانش سے مالا مال کرتی رہے گی۔ ادیبوں، صحافیوں، طلبہ اور علم دوست قارئین کے لیے ایک نادر تحفہ، ہر جلد اپنے آپ میں مکمل ہے۔

مکمل آٹھ جلدوں پر مشتمل، چھ جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

قیمت: -/1555 روپے

کلیات پریم چند

مرتب: مدن گوپال

اردو فکشن کے بنیادگزاروں میں منشی پریم چند کا نام سرفہرست ہے جنھوں نے ناول اور مختصر افسانے کی اصناف کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ انھیں وقار اور اعتبار بھی بخشا۔ منشی پریم چند کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز اردو سے ہوا تھا، پھر وہ ہندی میں بھی لکھنے لگے اور وہاں بھی اپنے عہد کی سب سے بڑی ادبی شخصیت کہلائے۔ کونسل نے پریم چند کی تمام تحریریں اس کلیات میں مجتمع کر دی ہیں جو 24 جلدوں پر مشتمل ہے۔

قیمت: (مکمل سیٹ) -/4071 روپے

اڑیسہ میں اردو

حفیظ اللہ نیولپوری

ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری کی یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اڑیسہ میں اردو کا تاریخی اور ثقافتی پس منظر بیان کیا گیا ہے، دوسرا باب اڑیسہ میں اردو شاعری کے ارتقا اور تیسرا اردو نثر کے ارتقا کے بیان میں ہے۔ چوتھا باب دو فصلوں میں منقسم ہے اڑیسہ کا اردو اسٹیج اور اردو ڈرامے اور اڑیسہ میں اردو صحافت۔ باب پنجم چار ذیلی عنوانات پر مبنی ہے اڑیسہ میں عہد جدید میں اردو، اردو تعلیم کی صورت حال، اردو کے ادبی اور ثقافتی ادارے، اردو کی اشاعتی سرگرمیاں۔ چھٹا باب 'حاصل مطالعہ' کے عنوان سے ہے جس میں تمام مباحث کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔۔۔ اپنے موضوع پر ایک جامع اور مستند کتاب۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 504، قیمت: -/157 روپے

سیر کہسار

پنڈت رتن ناتھ سرشار

اردو کے مایۂ ناز انشاپرداز اور ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار کا مشہور ناول جو مدتوں سے نایاب تھا۔

صفحات: 845، قیمت: -/167 روپے

اصول معاشیات

سید علی

یہ کتاب اعلیٰ ثانوی درجات کے طلبہ کو معاشیات کے بنیادی اصولوں سے واقف کرانے کی غرض سے لکھی گئی ہے۔

صفحات: 192، قیمت: -/47 روپے

تاریخ ادب اردو

مرتبہ: سیدہ جعفر، گیان چند جین

پانچ جلدوں پر مشتمل اس ضخیم کتاب میں اردو ادب کے عہد اولیں کے تمام مہیا مواد کا تحقیق شدہ نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔ اردو ادب کی مختلف تاریخوں میں یہ تاریخ اپنی خصوصیات کے باوصف منفرد اہمیت کی حامل ہے۔

قیمت: فی جلد 170 روپے، مکمل سیٹ: 850 روپے

للو لال جی کوی۔۔۔ایک ادبی سوانح

فورٹ ولیم کالج سے وابستہ قلم کاروں میں للو لال جی اہم مقام کے حامل ہیں۔ انھوں نے جدید ہندی نثر کی بنیاد ڈالی۔ اس کتاب میں ان کے احوال وکوائف کے ساتھ ساتھ ان کے معاصرین کا بھی مختصر طور پر تعارف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 280، قیمت: -/72 روپے

تامل ناڈو میں اردو

علیم صبا نویدی

اس کتاب میں 1824 سے 1986 کے درمیان تامل ناڈو کے اردو شعر وادب سے متعلق واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے اور تذکرے کے انداز میں تمام شعرا و ادبا کے حالات اور کلام کے نمونے درج کیے گئے ہیں۔

صفحات: 436، قیمت: -/135 روپے

جنت سنگار

ملک خوشنود، مرتبہ: پروفیسر سیدہ جعفر

ملک خوشنود کی مثنوی ''جنت سنگار'' (1645) دکنی ادب کے قدیم شہ پاروں میں سے ہے۔ کونسل نے اسے پروفیسر سیدہ جعفر کے مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔

صفحات: 590، قیمت: -/180 روپے

زراعتی انکشافات

پروفیسر محمد شفیع

اس کتاب میں زراعت سے متعلق مختلف موضوعات مثلاً زراعتی مٹی، کھاد، فصلوں کی عام بیماریوں، فصلوں پر کیڑوں کے حملے اور ان کا انسداد، ریشم اور شہد کی پیداوار، لاکھ اور جل کھمبی (Mushroom) کی کاشت اور مچھلی پالن وغیرہ موضوعات پر آسان زبان میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 260، قیمت: -/192 روپے

غرائب الجمل

شمس العلما نواب عزیز جنگ ولا

نظرثانی وترتیب: حسن الدین احمد

اس کتاب میں تاریخ گوئی کے اصولوں اور قاعدوں کو مفصل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان تاریخی قطعات کو بھی محفوظ کر دیا گیا ہے جو اب آہستہ آہستہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے جارہے ہیں۔

صفحات: 314، قیمت: -/78 روپے

ہندوستانی مصوری (عہدِ مغلیہ میں)

پرسی براؤن، مترجم: عبدالحق

مغلیہ عہد میں جہاں تمام فنون لطیفہ کو عروج حاصل ہوا وہیں فن مصوری میں نہ صرف بڑی ترقی ہوئی بلکہ اس فن کے نئے نئے پہلوؤں کا ارتقا ہوا۔ مغل مصوری صرف تصویر چہ (miniature) سازی نہیں، صرف کتابوں پر نقاشی نہیں، بہت کچھ اور بھی ہے اور یہ مصوری دنیا کے فنون لطیفہ کی تاریخ کا زریں باب ہے۔ اس کتاب میں مصوری کی تاریخ کے ساتھ ساتھ مصوری کی اقسام، طریقۂ کار، ساز وسامان، اہم مصوروں اور ان کے فنی نمونوں کی فہرست بھی درج کی گئی ہے۔

صفحات: 256، قیمت: -/158 روپے

قدیم ہندوستان میں شودر

رام شرن شرما، مترجم: جمال محمد صدیقی

شودر زمانہ قدیم سے ہی ظلم واستحصال کا شکار رہے ہیں۔ ممتاز مورخ ڈاکٹر رام شرن شرما نے 1000 قبل مسیح سے 500 تک تاریخی تناظر میں ہندوستان میں شودروں کی حالت کا جائزہ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

صفحات: 356، قیمت: -/82 روپے

فیودر دستوئیفسکی

ظ. انصاری

عظیم روسی ناول نگار فیودر دستوئیفسکی کا شمار دنیا کے بڑے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب دستوئیفسکی کی حیات اور اس کے کارناموں سے پوری طرح واقف کراتی ہے۔

صفحات: 184، قیمت: -/52 روپے

ہندوستانی مصوری — ایک خاکہ

انیس فاروقی

ہندوستان میں مصوری کی ایک وسیع روایت رہی ہے۔ تین حصوں میں منقسم اس کتاب میں ہندوستانی مصوری کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ مشہور مصور اور مصنف ڈاکٹر انیس فاروقی نے آسان زبان میں ایک مشکل موضوع کا تعارف پیش کیا ہے۔

صفحات: 168، قیمت: -/130 روپے

لغات ابجد شماری

سید احمد

اس کتاب کے پہلے حصے میں حساب ابجد کے مطابق حروف تہجی کی ترتیب سے دیے گئے الفاظ کے اعداد درج کیے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں اعداد کے تحت ترتیب وار الفاظ دیے گئے ہیں۔ فن تاریخ گوئی سے شغف رکھنے والے حضرات کے لیے ایک انمول تحفہ۔

قیمت: مکمل سیٹ (چار جلدیں) -/472 روپے

گلشن بے خار

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مترجم: حمیدہ خاتون

اس مشہور تذکرے میں کلاسیکی اردو شاعروں خاص کر دہلی کے شاعروں کے منتخب اشعار، ان کے مختصر حالات اور کلام پر شیفتہ نے فارسی میں تبصرہ اور تذکرہ تحریر کیا ہے۔ شیفتہ کی تنقیدی رائیں اردو تنقید اور شعر شناسی میں بے حد اہم مانی جاتی ہیں۔ حمیدہ خاتون نے سلیس اردو زبان میں اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

صفحات: 430، قیمت: -/128 روپے

حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات

سید ممتاز مہدی

حیدرآباد اردو ادب وصحافت کا ایک اہم مرکز ہے۔ اس تحقیقی کتاب میں حیدرآباد سے شائع ہونے والے اخبارات کی ادبی خدمات کے ساتھ وہاں کی صحافتی تاریخ بھی پیش کی گئی ہے۔

صفحات: 428، قیمت: -/92 روپے

وضاحتی کتابیات (22 جلدوں میں)

مرتبین (جلد اول تا سوم): گوپی چند نارنگ، مظفر حنفی

مرتب: (جلد چہارم تا بائیس): مظفر حنفی

وضاحتی کتابیات میں بیسویں صدی کے ربع آخر میں شائع ہونے والی تقریباً تمام اردو کتابوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ہر کتاب کا مختصر تعارف، مصنف، ناشر، سائز، صفحات اور قیمت وغیرہ بھی دی گئی ہے۔

قیمت (ایکس جلدیں): -/2489 روپے

مسدود راہیں

ترجمہ اور تعارف: زاہدہ زیدی

یہ کتاب دنیا کے عظیم ترین جدید ڈراما نگاروں یوجین لونیسکو (Eugene Lonesco)، سیگوئل دی پیراندیلو (Miguel de Pirandello)، ژاں پال سارتر (Jean Paul Sartre)، سیمول بیکٹ (Samuel Beckett) کے منتخب ڈراموں پر مشتمل ہے۔ ہر ڈرامے سے قبل زاہدہ زیدی نے ڈراما اور ڈراما نگار کا جامع تعارف تحریر کیا ہے۔ سب تراجم براہ راست اصل زبان سے کیے گئے ہیں۔

صفحات: 406، قیمت: -/126 روپے

انتظامی قانون کے اصول

ایم. پی. جین، ایس. پی. جین، مترجم: احمد مرزا

ہندوستان میں انتظامی قانون کے اصول اور مبادیات سے یہ کتاب تفصیلی طور پر متعارف کرتی ہے۔ انتظامی قانون ایک جدید صنف قانون ہے اور اس کے مسائل ونظریات ابھی عالم ارتقا میں ہیں۔ یہ کتاب تمام مسائل کا عمدہ بیان پیش کرتی ہے۔

صفحات: 612، قیمت: 120/- روپے

ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا

ایچ. این. سنہا، مترجم: محمد سلیم قدوائی

اس کتاب میں ہندوستانی تاریخ کی ابتدا سے عصر حاضر تک کے سیاسی اداروں، نظریوں اور روایتوں کا تنقیدی اور تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔

صفحات: 377، قیمت: 95/- روپے

وجے نگر کے عہد میں نظامِ حکومت اور سماجی زندگی

کے. اے. نیلکنٹھ شاستری

اس کتاب میں سلطنت وجے نگر کی تین صدیوں (1650-1336) پر مشتمل سیاسی، سماجی، معاشی وتمدنی تاریخ پیش کی گئی ہے۔

صفحات: 569، قیمت: 118/- روپے

چولا راجگان

کے. اے. نیل کنٹھ شاستری، مترجم: ریدمن سیٹھی

اس کتاب میں تمام دستیاب مآخذ کے حوالے سے جنوبی ہند کی چولا سلطنت (850 تا 1216) کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور چولوں کے نظام حکومت، مالیاتی نظام، اس عہد کے معیار زندگی، زراعت اور زمین کے حقوق، صنعت و تجارت، سکے اور ناپ تول کے پیمانے، تعلیم، ادب، آرٹ وغیرہ پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 1115، قیمت: 209/-

عشری درجہ بندی

میلول ڈیوی، مترجم: سید محمود حسن قیصر امروہوی

عصر حاضر میں کتابوں کی درجہ بندی کے لیے زیادہ تر کتب خانے ڈیوی کے وضع کردہ عشری درجہ بندی (Dewey Decimal Classification) کو بروئے کار لاتے ہیں۔ اس کتاب میں اس درجہ بندی سے متعلق تمام تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

صفحات: 908، قیمت: 167/- روپے

علی وردی اور اس کا عہد

کالی کنکر دتا، مترجم: عبدالاحد خاں خلیل

مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانے میں جو بہت ساری خودمختار سلطنتیں ہندوستان میں قائم ہوئیں ان میں حکومت بنگال بھی تھی جس کا حکمراں علی وردی خاں تھا۔ علی وردی خاں نے بڑی حد تک ایک مثالی حکومت قائم کی اور اس کے زمانے میں بنگال، بہار اور اڑیسہ میں بہت خوشحالی رہی۔ اس کتاب میں علی وردی خاں کے عہد حکومت (اپریل 1740 تا اپریل 1756) کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 392، قیمت: 86/- روپے

ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا

ایچ. این. سنہا، مترجم: محمد سلیم قدوائی

اس کتاب میں ہندوستانی تاریخ کی ابتدا سے عصر حاضر تک کے سیاسی اداروں، نظریوں اور روایتوں کا تنقیدی اور تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔

صفحات: 337، قیمت: 95/- روپے

ہندوستان کا نظامِ جمال

بدھ جمالیات سے جمالیاتِ غالب تک

(تین جلدوں میں)

مصنف: شکیل الرحمٰن

ہندوستان کی تاریخ وتہذیب کے پس منظر میں ہندوستانی فنون لطیفہ کا مطالعہ۔ رنگین تصاویر سے مزین ان جلدوں کی طباعت آرٹ پیپر پر کی گئی ہے۔

کل صفحات: 918، قیمت (مکمل سیٹ): 1311/- روپے

بھارت 2002

یہ کتاب اردو زبان میں بھارت کے بارے میں معتبر اور مفید معلومات کا خزانہ ہے۔ مرکزی اور صوبائی ملازمتوں کے مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے والے طلبہ کے لیے یہ کتاب خصوصی اہمیت اور افادیت کی حامل ہے۔

صفحات: 949، قیمت: 250/- روپے

عبدالرزاق

قومی اردو کونسل کی کارکردگیاں ـــ ایک جائزہ

قومی اردو کونسل نے 1996 میں ایک خودمختار ادارے کی حیثیت سے اپنی کارکردگی کا آغاز کیا تھا جو نویں منصوبے کے تحت وجود میں آئی اور حکومتِ ہند کے ماتحت اسے خودمختاری بھی دی گئی۔ قومی نوڈل ایجنسی کے طرز پر کام کرنے والی اس کونسل کی ذمے داریوں میں اُردو کی ترویج و ترقی کے لیے پالیسیوں کا نفاذ شامل ہے۔ خصوصاً اقلیتوں کو جن کی مادری زبان اردو ہے انھیں تعلیم کی آسانیاں فراہم کرانا نیز انھیں جدید ٹیکنالوجیکل منظرنامے اور روزگار سے جوڑنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ آج نوجوان نسل کے مسائل حل کروانے میں قومی اردو کونسل اہم رول ادا کر رہی ہے۔ تکنیکی دور کے تقاضوں کو پورا کر کے انسانی وسائل کے طور پر ان کی تربیت کرنا اردو کونسل کے مقاصد کا اہم حصہ ہے۔

اس کے علاوہ جن اغراض و مقاصد کے لیے قومی اردو کونسل کی بنیاد رکھی گئی ان میں اردو زبان کا فروغ اور اس کی ترویج و توسیع کی فضا ہموار کرنا نیز ایسے اقدام کرنا جن سے اردو زبان میں سائنسی اور تکنیکی ترقیاتی علوم کی توسیع شامل ہیں۔ اس میں اپنے تئیں حکومت ہند کو اردو زبان کے بارے میں صلاح و مشورے دینا بھی شامل ہے۔

جس طرح قومی اردو کونسل نے نئے وژن سے اپنے کام کی ابتدا کی وہ اردو کے حق میں نہایت مفید اور صحیح قدم ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں اردو کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے، اسے ثروت مند بنانے اور صحیح مقام تک پہنچانے کی کوششیں بھی ثمرآور ثابت ہوئیں۔

چونکہ اردو زبان دیگر زبانوں کی طرح اپنی ایک علاحدہ شناخت اور اظہار کا بہترین وسیلہ رکھتی ہے اسی لیے جدید کاری کو قبول کرنے کی اس میں بھی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ یہاں یہ بات بطور تحدیث نعمت کہی جا سکتی ہے کہ اردو میں باعتبار ٹیکنالوجی یورپی زبانوں کے ہم پلہ ہونے کی اہلیت موجود ہے۔ اردو کے مشہور ترین نستعلیق رسم خط کا اوپن ٹائپ یونی کوڈ میں فانٹ تیار ہو چکا ہے جو مغربی زبانوں کے بالمقابل انٹرنیٹ کے لیے عالمی سطح پر موزوں و کامیاب ہے اس لیے یہ آئی ٹی ٹیکنالوجی تجربات میں پہلی بڑی کامیابی تصور کی جائے گی۔

حکومت ہند کو اردو کے لیے ایک ایسی مشیری کی ضرورت درپیش تھی جو زبانوں کی پالیسی کا بخوبی نفاذ کر سکے، اس کی توسیع و ترویج کو علمی اور تکنیکی میدانوں میں عملی جامہ پہنا سکے چنانچہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو پہلی مرتبہ سرکاری طور پر یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ ایک قومی نوڈل ایجنسی کے طور پر ملک میں کام کرے۔ مزید برآں قومی اردو کونسل نے اپنی نہج پر ریاستی اردو اکادمیوں اور تعلیمی اداروں کے درمیان نیٹ ورکنگ کا کام کر کے ترقیاتی امور کو آگے بڑھایا۔

زبانوں کی ترویج و ترقی حکومتوں کی نیک نیتی پر بھی منحصر کرتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ 2000-1999 میں قومی اردو کونسل کے قائم کردہ صرف 54 کمپیوٹر مراکز تھے جن کی تعداد رفتہ رفتہ 2005-2004 میں بڑھ کر 225 ہو گئی۔ اسی طرح خطاطی مراکز جو 2002-2001 میں صرف 21 تھے، وہ 2005 تک 35 ہو گئے ہیں۔ اردو ڈپلوما کورس میں 2002-2001 میں طلبہ کی تعداد 3994 تھی، 2004-2003 اب تک طلبہ کے داخلوں کی تعداد 11000 تک پہنچ چکی ہے۔ علاوہ ازیں رواں تعلیمی سال کے دوران دو سالہ عربک ڈپلوما کورس میں 3687 داخلے ہو چکے ہیں۔

اردو پریس پروموشن اور اشتہارات کے مد میں 2001-2000 سے 2004-2003 تک بالترتیب 29 لاکھ، 28 لاکھ، 24 لاکھ، 28 لاکھ روپے سالانہ خرچ کیے گئے ہیں۔

کونسل کے تحت جاری اُردو ڈپلوما کورس بھی کافی مقبول ہوا ہے۔ کثیر تعداد میں غیر اردو داں حضرات اس سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ قومی اُردو کونسل نے اُردو کے ہر پہلو سے عوام کو مستفید کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ فن خطاطی جو ہماری تہذیب کا ایک قیمتی ورثہ ہے جسے ہم کبھی گم گشتہ نہیں دیکھنا چاہیں گے۔ اس کے مراکز اردو کے رسم الخط اور فنی تہذیب کو زندہ رکھے ہوئے ہیں اور اب یقینی طور پر اس کے روشن پہلو جدید کاری اور انفارمیشن ٹیکنالوجی سے بھی وابستہ ہو گئے ہیں۔

قومی اردو کونسل کی جانب سے ملک میں اردو ٹائپسٹوں اور اسٹینوگرافروں کی مانگ کو پورا کرنے کے لیے رضاکار تنظیموں کے اشتراک سے اردو ٹائپ اور شارٹ ہینڈ تربیتی مراکز قائم کرنے اور چلانے کی اسکیم بھی شروع کی گئی ہے۔

اردو میں تعلیمی اور تکنیکی مواد فراہم کرنے کی خاطر قومی اردو کونسل نے معیاری نصابی کتب کی اشاعت کی ذمے داری بھی لی ہے۔ اس ضمن میں مختلف مضامین میں سماجی سائنس، حیاتیاتی سائنس اور طبیعاتی سائنس کے علاوہ جدید ریاضیات کی متعلقہ نصابی کتب برائے درجہ ہشتم تا دہم منظر عام پر آ چکی ہیں۔

قومی اردو کونسل کا ایک شعبہ اشاعتِ کتب بھی ہے جس کے تحت مختلف موضوعات پر اب تک 1150 کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ کتابوں کے علاوہ ماہنامہ ''اردو دنیا''، اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' جیسے معیاری رسائل بھی پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔

اُردو کتابوں کی اہمیت اور ان کے قارئین کی تعداد بڑھانے کی غرض سے قومی اُردو کونسل نے اردو کتاب میلوں کے انعقاد کو بھی رواج دیا جو نہایت کامیاب رہا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ بہ نفسِ نفیس کتاب میلوں میں پہنچ کر انھیں کامیاب بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔

ان کتاب میلوں میں بچوں کے ادب سے لے کر عالمی ادب تک کی کتابیں دستیاب ہوتی ہیں، یہاں ماہرین لسانیات، ریسرچ اسکالر اور اساتذہ حضرات کے لیے ان کے مزاج اور ذوق کے پیش نظر ادبی تقاریب کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔ باذوق قارئین کو ہر موضوع پر مصنفین کی اہم اور نادر و نایاب تصانیف بہ آسانی دستیاب ہو جاتی ہیں۔

□□□

Centre for Development of Advanced computing,
Pune, (Maharashtra)

محمد خلیل

شیروں کی کم ہوتی تعداد

جنگلوں کے ختم ہونے سے بہت سے جانور اب باقی نہیں رہے ہیں۔ لیکن ان میں سے کئی چڑیا گھروں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انھی میں ایک شیر بھی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں شیروں کی تعداد چار ہزار سے زیادہ تھی جو شکار اور دیگر وجوہات سے 1972 میں گھٹ کر صرف 1827 رہ گئی۔ شیروں کے تحفظ کے لیے 1973 میں ایک منصوبہ شروع کیا گیا تھا لیکن تین دہائی گزر جانے کے بعد بھی اس کے حوصلہ افزا نتائج سامنے نہیں آسکے۔ اس کے بعد ان کی تعداد میں کچھ اضافہ ضرور ہوا تھا لیکن حالیہ دنوں میں ان کی تعداد میں تیزی سے کمی آئی ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق 1989 میں ان کی تعداد 4334 بتائی گئی تھی جو 2005 میں گھٹ کر 3600 تک جا پہنچی یعنی اس دوران 734 شیر ختم یا پھر غائب ہو چکے ہیں۔

سرسکا میں گذشتہ فروری 2005 میں شیروں کی گھٹتی تعداد کی خبر سے تشویش بڑھ گئی ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق سرسکا میں شیروں کی تعداد چوبیس (24) تھی لیکن اب وہاں ایک بھی شیر باقی نہیں ہے۔ یہی صورت حال دیگر مقامات پر بھی ہے۔ اسی طرح رنتھمبور سے بھی اٹھارہ لاپتہ ہیں۔ پنا میں چونتیس شیر باقی رہ گئے ہیں۔ وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے ان حالات کے مدنظر سخت قدم اٹھانے کے احکامات جاری کیے ہیں اور شیروں کے تحفظ کے لیے ان علاقوں میں ''ٹاسک فورس'' کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جو شیروں کے تحفظی انتظام کے مختلف پہلوؤں کا اعلیٰ پیمانے پر جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ حکومت کو اپنی سفارشات پیش کرے گی۔ وزیر اعظم نے 17/مارچ 2005 کو قومی جنگلاتی زندگی سے متعلقہ جرائم کو روکنے کے لیے بیورو قائم کیا ہے جس کا مقصد جنگلاتی زندگی کا غیر قانونی شکار و غیر قانونی طور پر جنگلات سے فائدہ اٹھانے پر روک لگانا ہے جو اس بڑے مسئلے کی اہم وجہ ہے۔ اگر اس پر سختی سے عمل درآمد ہو سکا تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ زمانۂ قدیم سے ہی جنگلات میں راجے اور مہاراجے تو انھیں شکار کرتے رہے ہیں اور ان کے لیے شکار کرنا ایک فخر کی بات تھی اس وقت جنگلات کی کمی نہیں تھی، جانوروں کی تعداد بھی کافی تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ پیڑوں کے کٹنے سے جنگلات کی تعداد گھٹتی چلی گئی اور شکار کی وجہ سے جانوروں کی تعداد بھی کم ہوتی گئی۔ اس کا سلسلہ عالمی روزگار سے جا ملا اور بازار میں ایک مرے ہوئے شیر کی قیمت تقریباً تین لاکھ روپے تک پہنچ گئی ہے جبکہ ایک شیر کا شکار کرنے میں صرف 40 روپے کا صرفہ آتا ہے اور تقریباً چھ سو روپے یا اس سے کچھ زیادہ دے کر معصوم قبائلی لوگوں سے اس کا شکار کرانے میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس غیر قانونی کام میں شکاریوں کے علاوہ اور کئی افراد شامل ہیں۔ یہ مسئلہ اس لیے بھی پیدا ہوا کہ 1973 میں جب تحفظی نقطۂ نظر سے منصوبہ شروع کیا گیا تو پوری توجہ محض شیروں کی نسل کی بہتری اور تعداد بڑھانے پر مرکوز رہی اور جنگلات کے تحفظ پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ کیوں کہ شیروں کی تعداد کم ہونے کی ایک خاص وجہ جنگلوں کا کم ہونا بھی ہے۔ کسی جنگلی علاقے میں اگر ایک شیر موجود ہے تو کم از کم اس علاقے میں ڈھائی یا تین سو چھوٹے جانوروں کا ہونا ضروری ہے کیونکہ شیر ایک گوشت خور جانور ہے لیکن اگر جنگل کم ہوتے رہے تو اس کے لیے خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ جنگل سے نکل کر انسانی بستیوں کی جانب چل پڑتا ہے۔ اس طرح یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ اگر ہمیں اپنے کو بچانا ہے تو جنگلات کا تحفظ بھی کرنا ہوگا۔ اگر ہم جنگلاتی مسائل کا جائزہ لیں تو صاف طور پر یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ جنگلات کو ختم کرنے کی ذمے داری پوری طرح سے انسانوں پر عائد ہوتی ہے۔ بڑے قومی پارکوں کا قیام اور بڑی شاہراہوں کی تعمیر میں کتنے جنگلات کو نقصان پہنچا ہے، ہم اس سے پوری طرح واقف ہیں۔ ہمیں اس روشنی میں پھر سوچنا ہوگا تاکہ جنگلات محفوظ رہیں۔

جانوروں میں خاص کر شیروں میں آپسی ملاپ یعنی اِن بریڈنگ سے متاثر ہو کر سفید اور پیلے باگھ مرنے لگے اور ان میں جسمانی کمیاں بھی ظاہر ہونے لگیں اور بیماری سے لڑنے کی طاقت ختم ہوگئی جس کے نتیجے میں جینیاتی امراض سے متاثر ہو کر نندن کانن (اڑیسہ) میں سفید شیروں کے مرنے کا واقعہ پیش آیا۔ عام شیروں کو بھی یہ بیماری متاثر کرتی ہے۔ یہاں یہ ذکر دلچسپ ہے کہ نندن کانن 1980 میں کس طرح ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ وہاں شیر کے ایک جوڑے سے دو سفید بچے پیدا ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جب 1951 میں ریوا کے راجا جنگل میں شکار کھیل رہے تھے تو انھوں نے ایک شیرنی کو دیکھا۔ اس کے کئی بچوں میں ایک بچہ بالکل سفید رنگ کا تھا شیر کسی نے دیکھا ہی نہیں تھا اسے دیکھ کر سبھی کو بڑا تعجب ہوا کیونکہ اس سے پہلے راجا نے اسے زندہ پکڑنے کا حکم دیا۔ آخر کار وہ زندہ پکڑ کر راجا کے محل میں لایا گیا۔ اس کی پرورش بڑی احتیاط کے ساتھ کی جانے لگی۔ راجا نے اس کا نام موہن رکھا اور اسی شیر نے ریوا شہر کا نام پوری دنیا میں مشہور کر دیا۔ بعد میں اسی شیر سے 1958 میں چار بچے پیدا ہوئے جو بھی سفید تھے، ان میں ایک نر اور تین مادائیں تھیں۔ نر کا نام راجا رکھا گیا۔ اس

طرح قدرت نے سفید شیر کی نسل کی شروعات کی۔ آج جو سفید شیر ملک کے مختلف چڑیا گھروں میں موجود ہیں وہ تمام موہن کی ہی نسل سے ہیں۔ سفید شیر آج بھی بہت کم تعداد میں موجود ہیں۔ ان کا شمار سب سے مہنگے جانوروں میں کیا جاتا ہے۔ آج سے تقریباً پچیس سال قبل سفید شیر کی قیمت تقریباً دس لاکھ روپے تھی جو آج بڑھ کر تقریباً دس گنا ہو گئی ہے۔

شیر مکمل طور پر گوشت خور ہوتا ہے اور موقعہ ملتے ہی شکار پر جھپٹ پڑتا ہے۔ چلتے وقت عام طور پر اس کے ناخن پنجے کے اندر ہوتے ہیں لیکن حملہ کرتے وقت باہر آجاتے ہیں جس سے وہ اپنے شکار کو اپنے پنجوں سے پکڑ لیتا ہے اور اس کے پنجے پوری طرح شکار کو جکڑ لیتے ہیں۔ اس کو کھانے کے لیے ہر روز پندرہ سے بیس کیلوگرام گوشت چاہیے۔ شیر سورج غروب ہونے سے کچھ قبل شکار کی تلاش میں نکل پڑتا ہے شکار نہ ملنے پر وہ پوری رات تلاش میں سرگرم رہتا ہے۔ یہ اکیلے رہتا ہے اور شکار بھی تنہا کرتا ہے۔ شکار کی تلاش میں یہ بیس یا پچیس کلومیٹر تک نکل جاتے ہیں لیکن شکار مل جانے پر زیادہ نہیں چلتے۔ اس کی نگاہ انسان کے مقابلے چھ گنا زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اس طرح رات میں وہ آسانی سے دیکھ سکتا ہے۔ چلتے وقت شیر کے دونوں پاؤں ایک ساتھ اٹھتے ہیں۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ پھسل رہا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شکار کو اس کے آنے کی آہٹ تک نہیں ہو پاتی اور شیر جھپٹ کر حملہ کر دیتا ہے۔ وہ تیز دوڑتے ہوئے کبھی لڑکھڑاتا نہیں۔ اس عمل میں اس کی دم پوری طرح مددگار ہوتی ہے۔ دوڑتے وقت اس کی دم مختلف زاویوں میں مڑتی رہتی ہے۔ یہ بلی خاندان کا سب سے بڑا جانور ہے۔ اس کا وزن تقریباً ساڑھے تین سو کلوگرام تک ہو سکتا ہے۔ لیکن سبھی شیر اتنے وزنی نہیں ہوتے۔ یہ تقریباً آٹھ قسم کے ہوتے ہیں لیکن اب ان کی صرف پانچ قسمیں باقی رہ گئی ہیں۔ یہ ایک گھنٹے میں چالیس کلومیٹر تک دوڑ سکتا ہے۔ یہ گھنے جنگلوں اور جھاڑیوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کی دو بڑی خوبیاں ہیں ایک تو یہ اپنے پنجوں کا نشان پہچان لیتے ہیں اور دوسرے انھیں اپنے پیشاب کی بو کا بھی احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ شکار کے لیے نکلتے ہیں تو پہچان باقی رکھنے کے لیے پنجے مار کر نشان بناتے جاتے ہیں اور کہیں کہیں پیشاب بھی کرتے رہتے ہیں جو ان کے رہنے کی جگہ تک واپس آنے میں مددگار ہوتی ہے۔ یہ اپنی زندگی کا زیادہ وقت تنہائی میں گزارنا پسند کرتے ہیں۔ یہ خواہش ہونے پر ہی مادہ کے قریب جاتے ہیں۔ یہ اپنے شکار کو بھاگنے کا پورا موقعہ دیتے ہیں اور شکار پر اس وقت حملہ کرتے ہیں جب وہ پوری طرح تھک چکا ہوتا ہے۔ شیر بخوبی جانتا ہے کہ شکار پر کب اور کتنی دوری تک دوڑانے کے بعد حملہ کرنا ہے۔ یہ مرے ہوئے جانوروں کا گوشت کھانا بھی پسند نہیں کرتے اور اپنے شکار کا تازہ گوشت کھانے کے بعد وہیں آرام کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پانی کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اور اپنے رہنے کی جگہ پر دوبارہ پہنچ جاتے ہیں۔ شیر تقریباً پورے سال جوڑا بناتے ہیں لیکن سال میں دو ایسے اوقات ہیں جب زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں ایک تو برسات کے موسم کے بعد نومبر میں اور دوسرے اپریل یعنی گرمی کے شروع کے دنوں میں۔ عام طور پر یہ پندرہ سال یا کچھ زیادہ عرصے تک زندہ رہتے ہیں۔

شیر جنگلاتی ماحولیاتی توازن قائم رکھنے میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ شیر کے شکار کو جب غیر قانونی قرار دیا گیا تو یہ امید تھی کہ ان کی گھٹتی ہوئی تعداد کو پھر پورا کر لیا جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوگا کیونکہ ایک طرف تو اس کی کھال مہنگے داموں میں فروخت ہوتی ہے، لوگ اسے سجاوٹ کے لیے استعمال میں لاتے ہیں۔ اس کے جسمانی حصوں کو دواؤں کی تیاری میں استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اس کے دانتوں کی بھی بڑی مانگ ہے۔ اس کی گھٹتی ہوئی تعداد ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اس کے شکار کو پوری طرح سے روکنا ہوگا تبھی ان کی کم ہوتی نسل کو بچایا جا سکے گا۔ اب وقت آگیا ہے کہ انسان جنگلات کی اہمیت و افادیت پر توجہ مرکوز کرے تبھی شیر باقی رہیں گے۔

H51DR Iqbal Lane,
Batla House, Jamia Nagar,
New Delhi-110025

آسان اردو شاعری

مرتبین: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ، تبسم تقی

یہ مختصر کتاب اردو کے ان طلبہ کے لیے ہے جو
اردو شاعری سے حظ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اس میں مستند شعرا
کی ایسی نظمیں شامل ہیں جو آسان زبان میں کہی گئی ہیں۔
جہاں جہاں کچھ مشکل الفاظ آگئے ہیں ان کے معنی
ہندی اور انگریزی میں دے دیے گئے ہیں۔

صفحات: 32، قیمت: -/15 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-۱، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: مدن گوپال
ترجمہ: فاخر شبیر عباسی

وجے نگر سلطنت

گنگا کے میدان اور دکنی سطح مرتفع کے درمیان آسان ذرائع ترسیل کی عدم موجودگی، ہندوستان کی جزیرہ نمائی طاقت کو عظیم بحری سلطنتوں کی حیثیت سے فروغ دینے میں معاون ثابت ہوئی۔ مزید یہ کہ اس کے نتیجے میں ایک طرف جزیرہ نما ہندوستان اور مغربی ایشیا و یورپ کے ممالک اور دوسری طرف جزیرہ نما ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا اور مشرق بعید کے ممالک کے درمیان تجارت کو بڑی حد تک فروغ حاصل ہوا۔ جنوبی ہند کی بحری ریاستوں میں موجود عظیم دولت نے گنگا کے میدانوں کے حملہ آوروں نیز غیر ملکی تاجروں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ مشرقی اور شمالی افریقہ، عرب، ایران اور وسط ایشیا کے علاقوں سے اکثر مہم جو اور غلام اپنا کاروبار کرنے کے لیے جزیرہ نما ہندوستان کی ریاستوں میں آئے تھے۔ عہد وسطیٰ تک ان میں سے بعض اتنے طاقتور ہو گئے تھے کہ مقامی رہنما مخصوص حالات میں اپنے مقامی دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لیے ان کی مدد حاصل کیا کرتے تھے۔

جنوبی ہند کے مندروں اور محلوں کی دولت کو لوٹنے کے ملک کافور کے معرکوں کے فوراً بعد بہمنی سلطنت کا ظہور ہوا۔ بعد میں یہ چار سلطنتوں میں تقسیم ہو گئی جسے انفرادی یا اجتماعی طور پر وجے نگر کی عظیم سلطنت کا سامنا کرنا تھا جسے دو بھائیوں نے قائم کیا تھا۔ آنے والے برسوں میں وجے نگر سلطنت بہمنی سلطنت کی جنوبی سرحد سے لے کر جزیرہ نما ہندوستان کے آخری سرے تک پھیل گئی۔ یہ غالباً سب سے عظیم سلطنتوں میں سے ایک تھی۔ اس کے دارالحکومت کی قلعہ بندی نے اپنے فطری قطعۂ زمین کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ کوئی بھی مخالف طاقت اس پر آسانی کے ساتھ حملہ نہیں کر سکتی تھی۔

ہرات کے سلطان کے ایک سفیر، عبدالرزاق نے (جو اپریل تا دسمبر 1443 میں وجے نگر میں قیام پذیر تھا) اس عظیم الشان دارالحکومت کی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''وجے نگر کا شہر ایسا ہے کہ آنکھ کی پتلی نے اس جیسی دوسری جگہ کبھی نہیں دیکھی، اور کان کو ایسی اطلاع کبھی نہیں ملی کہ دنیا میں اس کے برابر کی کوئی چیز کہیں موجود ہے۔''

وجے نگر سلطنت کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی وسیع ملکی، ساحلی اور غیر ملکی تجارت تھی۔ اس میں 300 بندرگاہیں تھیں۔ ان میں سب سے اہم بندرگاہ کالی کٹ کی تھی جس کے تجارتی تعلقات مالے، بحرالجزائر، برما، چین، عرب، فارس، مشرقی افریقہ، ابی سینیا وغیرہ کے ساتھ تھے۔ عربوں کے ساتھ تجارتی تعلقات یقیناً بہت گہرے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ وجے نگر سلطنت میں عربی نسل کے گھوڑوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جسے مقامی گھوڑوں سے برتر مانا جاتا تھا۔ (تمام دستیاب عربی گھوڑوں کو حاصل کرنے کے لیے وجے نگر کا سلطان پرتگالیوں کو 20,000 ڈالر سالانہ ادا کرتا تھا تاکہ گھوڑوں میں اس کی اجارہ داری قائم رہے)۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کالی کٹ میں واسکوڈی گاما کی آمد کے نصف صدی کے اندر پرتگال وجے نگر کو نہ صرف عربی گھوڑے بلکہ مخمل، قالین، ریشمی کپڑے، پرتگالی ریشم اور چینی ریشم کے پارچے، زعفران اور گلنار بھی سپلائی کرنے لگا تھا۔ پرتگال وجے نگر کو جواہرات برآمد کرتا تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایک سلطنت جو اپنی طاقت کے عروج کے دنوں میں ایک سے دوسرے سمندر تک پھیلی ہوئی تھی اور کرشنا ندی کے جنوب میں پورے جزیرہ نما ہندوستان کو محیط تھی، عظیم الشان عیش وعشرت اور دولت پر قابض تھی۔ اس کی تصدیق وجے نگر آنے والے بعض غیر ملکی سیاحوں اور تاجروں کی بیان کردہ تفصیلات سے ہوتی ہے۔

تفصیلات کے مطابق، تنگ بھدر اور اس کی معاون ندی کرشنا کے درمیان بسا ہوا رائے چور کا وسیع علاقہ وجے نگر اور بہمنی حکومت کی سلطنتوں کے درمیان تنازعہ کی ایک اہم کڑی تھا۔ یہاں پر اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی

جناب مدن گوپال کی بے حد اہم کتاب "Turning Points of Indian History" ہے جس میں ہندوستانی تاریخ کے ان پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے جنہوں نے ہندوستانی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ "اردو دنیا" میں اس کا ترجمہ "ہندوستانی تاریخ کے اہم موڑ" کے نام سے قسط وار شائع کیا جا رہا ہے۔

تھیں جن میں اکثر بہت ہی غیر اہم باتوں پر ہوتی تھیں، مثال کے طور پر ایک لڑائی کسی سنار کی بیٹی کے اغوا کو لے کر ہوئی تھی۔

وجے نگر کا ایک اہم راجا کرشن دیورائے تھا جو 1509 میں وجے نگر سلطنت پر تخت نشیں ہوا۔ اس کے پیادہ دستے میں تیرانداز اور کرائے پر حاصل کیے گئے غیر ملکی بندوقچی شامل تھے جو نیزوں اور دھاکہ خیز ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ سوار دستہ توشک کی طرح سلے ہوئے چمڑے کے کوٹ پہنتا تھا جن کے سروں پر آہنی خود ہوتے تھے اور ہاتھیوں کی پشت پر مسلح آدمیوں کا گروہ سوار ہوتا تھا۔

کرشن دیورائے نے اپنی تخت نشینی کے گیارہ برسوں بعد بیجاپور کے سلطان کی فوجوں پر حملہ کروایا تا کہ رائچور پر قبضہ کیا جاسکے۔ فرونا نومیز (Ferona Numiz) جو راجا کی فوج کے ساتھ تھا، کہتا ہے کہ ''شاہی خیمے بالکل کسی متحرک شہر کی طرح نظر آرہے تھے۔ جنگ کی صبح راجا کے خیمے میں نقارے، نفیریاں اور دوسری موسیقی بجنا شروع ہوگئی اور لوگوں نے شوروغل مچانا شروع کردیا، ایسا لگتا تھا جیسے آسمان زمین پر اتر آئے گا۔

جب لڑائی میں وجے نگر کی شکست نظر آنے لگی اور راجا نے دیکھا کہ اس کے فوجی میدان چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں تو اس نے انھیں غدار قرار دیا۔ اس نے کہا کہ چونکہ سبھی کو مرنا ہے اس لیے دستور کے مطابق انھیں اپنی قسمت کا سامنا بہادری کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اس نے اپنی بلند آواز میں پوچھا کہ کون ہے جو اس کا ساتھ دے گا۔ سبھی سرداروں اور سپہ سالاروں نے اسے حلقے میں لے لیا اور اس کی آواز پر لبیک کہا۔ کرشن دیو رائے نے کہا کہ حساب کا دن آگیا ہے۔ عادل خاں یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے دنیا کے سب سے عظیم حکمراں کو قتل کیا تھا، لیکن اسے یہ شیخی بگھارنے کا موقع کبھی نہیں ملے گا کہ اس نے اسے شکست دی تھی۔ راجا نے اپنی انگلی سے ایک انگوٹھی نکال کر اپنے ایک ملازم کو دیا تا کہ وہ اس کی موت کے بعد اس کی رانیوں کو علامت کے طور پر دکھا سکے اور وہ دستور کے مطابق خود سوزی کر کے ستی ہوجائیں۔ پھر وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنی باقی بچی ہوئی ٹکڑیوں کو حکم دیا کہ وہ سبھی بھاگنے والوں کو بغیر کسی رحم کے قتل کردیں۔ اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں اپنی جان گنوانے کی بجائے انھوں نے واپس لوٹ کر دشمن پر حملہ کردیا۔ حملہ اس قدر شدید تھا کہ بیجاپور کے سلطان کی فوج میں شامل موروں میں سے کوئی بھی وجے نگر کی فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، موروں کی صفوں میں اس قدر افراتفری مچ گئی کہ انھوں نے اپنے خیموں کی حفاظت کرنے کی بھی کوشش نہیں کی جسے انھوں نے مضبوطی سے تیار کیا تھا۔ شکست خوردہ لوگوں کی طرح خود کو بچانے کی کوشش میں وہ ندی میں کود پڑے۔ راجا کے سپاہیوں اور ہاتھیوں نے بغیر دم لیے ہوئے انھیں نیست و نابود کردیا۔ وہ آدمیوں کو اپنی سونڈوں میں جکڑ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں چیر دیتے تھے۔

دوسری جانب راجا وجے نگر کے پرتگالی ملازموں نے مشاق نشانے بازوں کی حیثیت سے اپنا کام بخوبی انجام دیا۔ بیجاپور کی فوج کو تباہ و برباد کردیا گیا اور رائچور کو مشروط طور پر مطیع کرلیا گیا۔ اپنی بہادری کی طرح ہی رحم دلی کے لیے مشہور کرشن دیورائے نے وہاں کے باشندوں کو یقین دلایا کہ ان کی زندگیاں اور جاگیریں بخش دی جائیں گی اور ایسا ہی ہوا۔ کرشن دیورائے کی موت تک سلطنت کی شان و شوکت برقرار رہی۔ اس کے بعد سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ انتظامی امور اس کے دو برادران نسبتی کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ اور حکمراں، وزرا کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن گئے۔

وزرا میں سے ایک رام راج عظیم صلاحیتوں کا مالک تھا۔ وجے نگر سلطنت کے جاہ و حشم کو دوبارہ واپس لانے کے عزم کے ساتھ اس نے بہمنی سلطنت کی چار جانشیں ریاستوں کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا۔ اس نے بیجاپور کے خلاف احمد نگر، گولکنڈہ اور وجے نگر کے درمیان ایک جعلی اتحاد قائم کیا اور بعد میں بیجاپور اور گولکنڈہ کے ساتھ مل کر احمد نگر کے خلاف ایک معاہدہ کیا۔ اس کے نتیجے میں جو لڑائی ہوئی، اس میں ریاست احمد نگر کو نیست و نابود کردیا گیا اور لاتعداد دہقانوں کو تہہ تیغ کردیا گیا۔ احمد نگر کے سلطان حسین نظام شاہ نے امن کی درخواست کی۔ اسے رام راج کے سامنے لایا گیا۔ دونوں نے ہاتھ ملائے لیکن سلطان نے محسوس کیا کہ اس نے اس کے مرتبے کا لحاظ نہیں کیا۔ اس لیے اس نے اپنے ہاتھ دھونے کے لیے پانی مانگا (جواب گندا ہوگیا تھا)۔ رام راج نے اپنی ہتک محسوس کی۔ جواب میں اس نے بھی اپنے ہاتھ دھوئے اور سلطان سے کہا کہ اگر وہ اس کا مہمان نہ ہوتا تو اس کے ہاتھ کاٹ کر اس کے کندھے پر لٹکا دیے جاتے۔ تلخیاں پیدا ہوگئیں اور ایک طرح سے ہنگامہ برپا ہوگیا۔ رام راج سبھی دوسرے سلطانوں کے سفیروں کا کھلے عام مخالف ہوگیا، جس سے معاملہ اور بھی خراب ہوگیا۔ وہ انھیں نشستیں نہیں دیتا تھا۔ دراصل، وہ ان کے ساتھ تکبر اور حقارت کے ساتھ پیش آتا تھا۔

اس معاملے نے جلد ہی بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈہ اور بیدر کے چاروں

سلطانوں کو متحد کردیا۔ بیدر کے علاوہ سبھی جماعتوں کے اتحاد کو ازدواجی رشتوں کے ذریعے اور مضبوط کردیا گیا۔ ان سبھی نے بیجاپور کے نواح میں اپنی فوجوں کو جمع کیا۔

رام راج کو اس کی خبر ملی اور اس نے اپنی فوجوں کو بلایا۔ لوگوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا اور انھوں نے کرشنا ندی کے کنارے تالی کوٹ سے چند میل کے فاصلے پر مورچہ سنبھال لیا۔ سبھی قلعوں پر قبضہ کرلیا گیا۔

کسی طرح ایک حکمت عملی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطانوں کی مشترکہ فوجوں نے وجے نگر کی فوجوں کو دھوکے میں رکھ کر ندی کو عبور کرلیا۔ اب لڑائی یقینی ہوگئی تھی۔ احمد نگر کے پاس، جو کہ اس اتحادی فوج کا بنیادی محرک تھا، بہترین توپ خانہ ہونے کی بنا پر فوقیت حاصل تھی جو کہ ایک ترکی افسر کی ماتحتی میں تھا۔

وجے نگر کی بدقسمتی تھی کہ رام راج نے، جو کہ پچانوے برس کا ضعیف العمر شخص تھا، ایک پالکی میں سوار ہوکر میدان جنگ میں جانے پر زور دیا۔ وہ بہت سارے سونے اور جواہرات کے ڈھیر کے ساتھ ایک گدی پر بیٹھا جسے وہ بہادری اور شجاعت کے لیے انعام کے طور پر بانٹنے کے لیے لایا تھا۔

23 جنوری 1565 کو لڑائی کا آغاز ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شہنشاہ اکبر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کے لیے ایک دارالحکومت کی تلاش میں تھا جو اسے چھ برسوں کے بعد فتح پور سیکری کی شکل میں ملی۔ لڑائی کا آغاز وجے نگر کے سوار دستے کے خطرناک حملے کے ساتھ ہوا۔ اتحادی فوجوں کی توپوں نے جوابی حملہ کیا۔ وجے نگر کی فوجوں پر اس کا شدید اثر ہوا۔ ان میں انتشار پیدا ہوگیا۔ نظام شاہ کا ہاتھی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا۔ رام راج کے پالکی بردار ہراساں ہوگئے اور وہ اپنا فرض بھول کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ رام راج کو پکڑ کر نظام شاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا جس نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کا سر قلم کردیا۔ اس کے سر کو نیزے میں لٹکا کر فوج کے سامنے لے جایا گیا۔ راجا کے سر کو دیکھتے ہی وجے نگر کی دہشت زدہ فوجیں بدحواس ہوگئیں۔ وہ ہمت ہار گئے اور تتر بتر ہوکر جدھر بھی سینگ سمائے، بھاگ کھڑے ہوئے اور دشمنوں نے ہر سمت میں ان کا تعاقب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ کرشنا ندی کا پانی خون سے لال ہوگیا تھا۔ تاراجی بے حد شدید تھی۔ سلطان نے صرف ہاتھیوں کو اپنے پاس رکھا۔ باقی مال غنیمت سپاہیوں نے آپس میں تقسیم کرلیا۔

سلطان کی فوجوں نے اب وجے نگر کی جانب پیش قدمی کی۔ تیسرے دن اس کے خاتمے کا آغاز ہوا۔ فاتحوں نے تازہ دم ہونے کے لیے میدان جنگ میں قیام کیا۔ دس دنوں کے اندر وہ اس عظیم الشان شہر میں پہنچے جس نے اب تک فوجی پسپائی کے کئی مناظر دیکھے تھے۔ لیکن اس بار حالات مختلف تھے۔ تباہی کی خبریں دارالحکومت میں پہلے ہی پہنچ چکی تھیں۔ وہاں خوف و ہراس کا ماحول تھا۔ یہاں تک کہ وہ شہزادے جنھیں دارالحکومت کو حملہ وروں سے بچانے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا، اپنے حواس کھو بیٹھے۔ انھوں نے خزانے کی بیش قیمتی چیزوں کو ہاتھیوں پر باندھا اور تیزی کے ساتھ شہر چھوڑ کر بھاگے۔ کہا جاتا ہے کہ ان خزانوں کو لے جانے کے لیے پانچ سو سے زیادہ ہاتھیوں کی ضرورت پڑی تھی۔

بارھویں دن بعض مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد سلطان کی فوجیں دارالحکومت میں داخل ہوئیں۔ سیول (Sewell) کے مطابق ''پانچ مہینوں تک وجے نگر کو آرام نصیب نہیں ہوا۔ دشمن اسے تباہ کرنے آئے تھے اور انھوں نے اپنا مقصد پوری بے رحمی سے پورا کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی بھی چیز انھیں اس سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ انھوں نے وہاں کی بلند و بالا عمارتوں کو مسمار کردیا، جہاں سے راجا جشن کا نظارہ کیا کرتا تھا اور انھوں نے نقاشی کے تمام کاموں کو مسمار کردیا۔ انھوں نے شاندار طریقے سے سجائی گئی عمارتوں کو نذر آتش کردیا۔ ندی کے کنارے بنا ہوا وٹھل سوامی مندر، اور سنگتراشی کے نفیس نقش و نگار کو برباد کردیا گیا۔ آگ اور تلوار، کسی اور کلہاڑیوں سے، انھوں نے تباہی و بربادی کا اپنا کام عرصے تک جاری رکھا۔ دنیا کی تاریخ میں کبھی بھی کسی نے اتنی زبردست تاراجی نہیں دیکھی ہوگی اور وہ بھی اتنی تیزی کے ساتھ کہ ایک شاندار شہر جو دولت کی فراوانی کے ساتھ فراغت کی زندگی بسر کررہا تھا، دوسرے ہی دن تسخیر کرلیا گیا، اور لوٹ کر برباد کردیا گیا۔

حالانکہ رام راج کے جانشینوں نے پنو کونڈو (Penukondo) اور بعد میں چندر گیری (Chandragiri) میں دوبارا اپنے پاؤں جمانے کی کوشش کی لیکن تالی کوٹ کی لڑائی ہندوستان کی سب سے زیادہ فیصلہ کن جنگوں میں سے ایک ثابت ہوئی۔ وجے نگر کے زوال نیز بہمنی حکومت کی جانشیں ریاستوں کے اندرونی خلفشار نے شمال کی جانب سے مغل حملہ آوروں کے لیے راستہ ہموار کردیا۔

□□□

عابد سہیل

احمد جمال پاشا

احمد جمال پاشا کے لیے لکھنا ایسا ہی تھا جیسے ہمارے آپ کے لیے سانس لینا۔ کچھ نہیں تو خط لکھ رہے ہیں۔ یار دوست غپ بازی میں مصروف ہیں لیکن وہ گردن جھکائے لکھے جا رہے ہیں۔ کوئی ایک آدھ جملہ ان کی طرف اچھال دیتا ہے تو اس کا جواب بھی دے دیتے ہیں، جواب نہیں سوجھتا تو خاموش رہتے ہیں، اگرچہ ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ لیکن لکھنا برابر جاری رہتا ہے۔

جمال کی ساری ادبی زندگی کا نچوڑ ایک جملے میں پیش کرنا ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک لکھتے رہنا ہی کامیابی کی کنجی ہے۔ اس کنجی کا راز جمال کو ان دوستوں سے ہاتھ لگا تھا جو اسے اپنی تجوری میں مقفل کر کے بھول گئے تھے اور دوسروں کے کاموں میں کیڑے ڈالنے میں لگے رہتے تھے۔

جمال کی مزاح نگاری کا آغاز مذاق مذاق میں ہوا۔ 1953 یا 1954 کی بات ہے۔ یونیورسٹی میں سالانہ ہڑتال چل رہی ہے۔ اس سال اس میں جوش و خروش، غم و غصہ اور طلبہ کی عام حمایت کا مسالہ زیادہ شامل ہے۔ تین طلبہ یونین بلڈنگ میں بھوک ہڑتال پر ہیں اور خطرہ ہر وقت منڈلا رہا ہے کہ پولیس کی ٹکڑیاں جو سڑک کی دوسری جانب ذرا سے فاصلے پر، اس وقت کے ''منکی برج'' (اس وقت کا پل ''منکی برج'' کہلاتا تھا اور موجودہ ہوٹل کلارک کے آس پاس تھا۔ ''ہنومان سیتو'' 1966 یا اس کے آس پاس تعمیر ہوا۔) کی اوٹ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں، کسی وقت بھی چھاپہ مار کر بھوک ہڑتالی طلبہ کو میڈیکل کالج منتقل کر سکتی ہیں۔ یونین بلڈنگ کے سامنے کی سڑک پر جو اس وقت تقریباً میدان کی طرح تھی، دریاں بچھی ہیں، جن پر سیکڑوں طلبہ بیٹھے ہیں، بھوک ہڑتالیوں کی حفاظت کے لیے۔ یہ سلسلہ دو دن سے جاری ہے۔ لیکن نہ ''معتبر'' ذرائع سے حاصل ہونے والی خبروں کا تانتا ٹوٹتا ہے، نہ پولیس چھاپہ مار کر بھوک ہڑتالیوں کی دلی مراد بر لاتی ہے کہ کچھ پیٹ میں تو جائے۔

رات بھیگ چکی ہے، اکتوبر یا نومبر کا مہینہ ہے اور گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ پولیس کے چھاپے کی صورت میں مقابلہ کیا جائے یا صرف پرجوش و پرشور احتجاج۔ بحث میں شامل طلبہ میں کچھ کمیونسٹ ہیں، کچھ سوشلسٹ، کچھ کانگریسی ہیں، کچھ ونوبا بھاوے کے مقلد، کچھ انقلاب پسند رومانی، کچھ رومان پسند انقلابی، کچھ ایسے جو مسئلے کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور کچھ ایسے جو اسے نظریے کی چوکھٹ میں سجاتے ہیں۔ جب بحث میں گرمی کا عنصر دلیل سے زیادہ ہو گیا، بھویں تن گئیں، آستینیں چڑھالی گئیں، منہ سے جھاگ نکلنے لگے تو جمال غپ سے بولے۔

''بھائی میں تو عدم تشدد کا قائل ہوں۔ بھولو پان والے کا قرض بہت بڑھ گیا ہے۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے گھور کر دیکھتا ہے تو جان ہی نکل جاتی ہے۔''

ان کے اس جملے نے ساری بحث ختم کردی۔ جمال کے تین دوستوں میں سے جو وہاں موجود تھے، عبدالحلیم اور مرزا پھویا (غضنفر صدیقی) تو خاموش رہے، لیکن عابد سہیل نے سینئر ادیبوں کی طرح مربیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے جمال کو مشورہ دیا۔

''جمال تم مزاحیے کیوں نہیں لکھتے، تم میں تو بلا کی صلاحیت ہے۔''

''مزاحیہ کیا؟'' جمال پوچھتے ہیں۔

''مزاحیہ۔۔۔ یعنی۔۔۔'' عابد سہیل گڑبڑا جاتے ہیں۔۔۔ ''ارے بھی مزاحیہ مضامین''

معلوم نہیں اس وقت جمال کی سمجھ میں آیا کہ نہیں کہ مزاحیہ کیا ہوتا ہے لیکن اگلے روز جمال قاضی باغ میں ''اختر منزل'' آئے، شرمائے شرمائے، لجائے لجائے، تو انھوں نے سگریٹ کی ڈبیا کے ساتھ جیب سے چار پانچ مڑے تڑے کاغذ نکالے۔

یہ جمال کا پہلا مزاحیہ تھا۔

لیجیے، جمال نے مزاحیے لکھنے شروع کردیے۔ وہی جمال جو دوستوں کی خاطر چھرا نکال لیتا ہے، حلیم خاں کو ذلیل کرنے کی والد کی کوشش کے بعد بطور احتجاج جس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی، چند روپے ہاتھ آتے ہی جو دوستوں کے گھر جا کر کہتا ہے۔۔۔ ''یار کہیں چلو، روپے کاٹ رہے ہیں''، دیکھتے ہی دیکھتے ادیب بن گیا۔ لیکن ادیبوں کی ایک ادا بھی تو اسے نہیں آئی۔۔۔۔ نہ چہرے پر سنجیدگی کی مصنوعی چادر، نہ گفتگو میں تصنع، نہ بڑے بڑے ادیبوں کے الٹے سیدھے حوالے، نہ فلسفہ، نہ حکمت، نہ فرد کی تنہائی، نہ تنہائی کا فرد۔ لیکن یہ سب کچھ چاہے اسے نہ آیا ہو، مزاح نگار ہے وہ چوکھا۔

میں جمال کو عظیم مزاح نگار نہیں مانتا، کوئی نہیں مانتا۔ لیکن اس کی ایک عظمت کا ذکر ضرور کروں گا۔ جمال اپنا مزاحیہ کسی دوست کو سنائیں یا کسی ادبی نشست میں پڑھیں اور کوئی کہے کہ یہ جملہ یوں نہیں یوں ہونا چاہیے تو معنی خیز انداز میں سر ہلائیں گے اور جیب سے قلم نکال کر جملہ اسی

وقت درست کرلیں گے۔

عابد سہیل نے اس قلب ناہیت کی اطلاع حلیم خاں کو دی، حلیم نے اقبال مجید کو، اقبال مجید نے قمر رئیس کو، قمر رئیس نے ڈاکٹر محمد حسن کو اور ڈاکٹر محمد حسن نے مجاز کو، جنھوں نے ان کا پہلا مزاحیہ ''سگریٹ چینا'' سن کر حضرت گنج میں یونیورسل بک ڈپو کے سامنے والے فٹ پاتھ پر پان کی دکان کے سامنے ''بھئی خوب لکھتے ہو، خوب لکھتے ہو'' کہا تو جمال باقاعدہ مزاح نگار بن گئے۔

ان دنوں لکھنؤ یونیورسٹی میں دوستوں کا ایک مثلث تھا، عبدالحلیم خاں، عابد سہیل اور احمد جمال پاشا۔۔۔حلیم جنھوں نے تاریخ کے موضوعات پر چند بہت عمدہ مضامین لکھے تھے، عابد سہیل جنھوں نے اپنا افسانہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسہ میں پڑھا تھا تو باقر مہدی نے جو اپنے مزاج کی سیماب صفتی اور صاف گوئی کے لیے مشہور تھے، کہا تھا ''صرف موضوع کی اہمیت کی خاطر نصف گھنٹہ ضائع کیا'' اور احمد جمال پاشا تو خیر احمد جمال پاشا تھے ہی۔

پھر اس مثلث میں سے کوئی ومدار ستارے کی طرح ٹوٹ کر الگ ہوتا تو اس میں باری باری اقبال مجید، قمر رئیس، قاضی عبدالستار، حسن عابد اور آغا سہیل ایک ایک کرکے شامل ہوتے رہتے، لیکن رہتا یہ بہرحال مثلث ہی۔ عابد سہیل، جمال اور حلیم کے بعد اس نے اقبال مجید، جمال اور قمر رئیس کی شکل اختیار کی۔ اس کے بعد جمال، اقبال مجید اور غضنفر، پھر جمال، عابد سہیل اور حسن عابد۔ غرض لوگ بچھڑتے ملتے اور جدا ہوتے رہے لیکن اس میں جمال کی وہی حیثیت رہی جو علم الحساب میں ایل.سی.ایم (L.C.M.) کی ہوتی ہے۔

یہ گروپ درجنوں بار بگڑا اور بنا لیکن تین دوسری چیزیں اپنی جگہ قائم رہیں، اقبال مجید اور رتن سنگھ کی افسانہ نگاری جنھوں نے بالترتیب ''عذ وچا'' اور ''بادی'' لکھ کر اپنی دھاک جمادی تھی اور جمال کی مزاح نگاری۔ اس مثلث میں جمال، عابد سہیل اور حلیم خاں کی اقلیدسی شکل کو بہرحال خاصی پائدار حیثیت حاصل تھی اور ٹوٹنے، بکھرنے کے بعد اس کے یہ تینوں زاویے جانے کیسے پھر یکجا ہو جاتے تھے۔

انھی دنوں اس مثلث کو ایک زبردست ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یونیورسٹی میں چند طلبہ سے ان کی کہا سنی ہوگئی اور ان میں سے کسی کی ہمت بھی نہ پڑی کہ مخالف گروپ سے ''سمجھ لیں گے'' تک کہہ پاتا۔ اس دن ان تینوں پر صحت کی اہمیت آشکارا ہوئی اور انھوں نے کسرت شروع کرنے کا ایک باقاعدہ پروگرام بنا ڈالا۔ فیس جس کا انتظام حلیم خاں نے کیا تھا، جمع کرکے ایک جیم میں داخلہ لے لیا گیا، اور طے پایا کہ حلیم جو مولوی گنج میں رہتے تھے، صبح صبح اٹھ کر یحییٰ گنج سے عابد سہیل کو لیں گے، پھر یہ دونوں امین آباد کے ''نہ گھر میرا نہ گھر تیرا'' والے ''رین بسیرا'' نامی مکان سے جمال کو اور پھر کچے حاطے والے جیم میں جس کے روح رواں اکھن نامی ایک نہایت خوبصورت اور وجیہ نوجوان تھے، کسرت کی جائے گی۔ چند روز بعد اس پروگرام میں ایک مد کا اضافہ ہوگیا۔ کسرت کرنے کے بعد یہ تینوں نظیر آباد جاتے اور تاج ریسٹورنٹ کی مشہور پوری ترکاری کھاتے اور اس کے بعد لب دوز، لب سوز اور بقول کسے ''لب دھز'' چائے پیتے۔ پندرہ بیس دن بعد کسرت کا سلسلہ تو ختم ہوگیا لیکن تاج ریسٹورنٹ کا پروگرام مہینوں چلتا رہا۔

ان دنوں جب کسی پان یا ہوٹل والے کا بہت زیادہ قرض چڑھ جاتا تو وہ سڑک جس پر یہ دکان ہوتی، ہم لوگوں کے لیے بند ہو جاتی اور اسے ''بند سڑک'' کے نام سے یاد کیا جانے لگتا۔ عابد سہیل کو یحییٰ گنج سے یونیورسٹی جانے کے لیے راجہ بازار کے بیچ در بیچ گلیوں کا سہارا لینا پڑتا اور جمال کے اپنے گھر سے نظیر آباد پہنچنے کے لیے تین راستوں میں سے دو بند ہیں لیکن ان کو معلوم نہیں کیا ضد ہے وہ ادھر کے وہی راستے اختیار کرتے ہیں جو بند ہوں۔ ان میں سے ایک سڑک پر اس پان والے کی دکان ہے جو جمال کے دوستوں کو دیکھتے ہی مونچھوں پر تاؤ دینے لگتا ہے لیکن جمال کی شخصیت میں معلوم نہیں کیا سحر ہے کہ ان کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا ہے اور چار مینار کی ڈبیا مانگے بغیر ان کے حوالے کر دیتا ہے۔ حلیم کی حیثیت ''مشکل کشا'' قسم کی ہے۔ قرض کی رقم بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے تو پانچ دس روپے دے کر قرض خواہوں کی زبان بند کر دیتے ہیں اور جمال ہوں یا عابد سہیل، دوبارہ شیر بن جاتے ہیں۔

دوستوں کی لڑائیاں بھی دوستی کی توسیع ہی ہوتی ہیں۔ حلیم اور جمال کے درمیان سخت قسم کی لڑائی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے، لیکن عابد سہیل کے سبب، جن کا خود بھی اس لڑائی میں تھوڑا بہت ہاتھ ہے، یہ ڈورا بھی ٹوٹی نہیں ہے۔ انھوں نے جمال پر ایک طویل نظم لکھ کر حلیم کے حوالے کر دی ہے اور حلیم ٹیگور لائبریری کے سامنے والے لان کے اس کونے میں جو گرنانی کے ہوٹل کے پاس ہے، ایک درخت کے نیچے پتھر کی لمبی سی بنچ پر بیٹھے ہوئے یہ نظم مشترک دوستوں کو سناتے ہیں۔ جمال کے سرخ سپید چہرے پر ایک رنگ آتا ہے، ایک جاتا ہے اور جب وہ ان مصرعوں پر پہنچتے ہیں:

....

پان والے سے جاکے پوچھا پتا
بولا ''وہ اس گلی میں رہتا ہے
میرا بھی اس پہ قرض باقی ہے''

تو جمال کو ضبط کا یارا نہیں رہتا اور وہ اپنی چپل سے حلیم کو نشانہ بناتے ہیں۔ چپل تو خیر حلیم کے کان کے پاس سے نکل جاتی ہے لیکن یہ دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں اور قبل اس کے کہ احباب بیچ بچاؤ کریں، جمال کا چشمہ حلیم کے حملے کی تاب نہ لاکر گر جاتا ہے اور اس کے دونوں شیشے پتھر سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتے ہیں۔ سنہری کمانی کا یہ خوبصورت چشمہ جمال اسی دن پہلی بار پہن کر

آئے ہیں۔ حلیم کمانی اٹھا کر ان کے ہاتھ میں دیتے ہیں تو جمال کہتے ہیں:

"گھر کیسے جاؤں گا؟"

حلیم انھیں اپنی سائیکل پر بٹھا کر امین آباد تو پہنچا دیتے ہیں لیکن راستے میں ان سے بات نہیں کرتے۔ اس واقعہ کو بمشکل تین ہی چار دن گذرے تھے کہ ایک شام جمال نے حلیم کے مکان کے دروازے کی زنجیر کھٹکھٹائی۔ حلیم نے چھجے سے جھانک کر عابد سہیل سے کہا۔

"جمال ہے!"

"جمال۔۔؟"

حیرت اور خجالت دونوں کے چہروں پر تو بڑے لگائے تھی۔ حلیم نے دروازہ کھولا۔ جمال اندر آ گئے لیکن خاموشی نے دونوں کے زبانوں پر تالے ڈال رکھے ہیں۔

مکان کے بیرونی حصے کی پہلی منزل کا بڑا سا کمرہ دوست یاروں کا اڈہ تھا، جس کے زینے پر جمال کچھ اس طرح چڑھ رہے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، کمرے میں داخل ہوتے ہیں لیکن خاموشی اب بھی ان تینوں کے درمیان دیوار بنی کھڑی ہے۔ اتنے میں جمال جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالتے ہیں۔

"صبح سے نوٹ کاٹ رہا ہے، خرچ کیسے کروں؟"

حلیم خاں، جن کی پٹھانی ان کے آگے آگے چلتی ہے، نم آنکھوں سے جمال کو دیکھتے ہیں اور عابد سہیل جو اپنی شخصیت پر ایک دبیز نقاب ڈالے رہتے ہیں، دوسری طرف دیکھتے ہوئے اپنے آنسو پونچھتے ہیں لیکن اس طرح کہ دونوں میں سے کسی کی نظر نہ پڑے۔

جیب میں پیسے نہ ہوں تو جمال دوستوں سے بھی لڑ سکتے ہیں، ان سے خفا رہ سکتے ہیں، لیکن روپے ہاتھ آئے نہیں کہ انھیں دوستوں کی یاد آئی، بے تحاشہ یاد، جسے کوئی خفگی، کوئی ناراضگی، کوئی غصہ روک نہیں سکتا۔۔۔۔ اس دن کے بعد ان تینوں کے درمیان ٹیگور لائبریری کے سامنے والے لان کے واقعہ کا کبھی ذکر تک نہ آیا۔

جمال یکا یک چپ چپاتے علی گڑھ چلے گئے اور وہاں سے اردو میں ایم اے کر کے لوٹے تو "اسکالر" کا پیروڈی نمبر ایڈٹ کر چکے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے بہترین ادبی جریدے ان کے مضامین کے منتظر رہنے لگے تھے اور ان کے مزاحیہ مضمون "ادب میں مارشل لا" کو ادب میں وہی حیثیت حاصل ہو چکی تھی جو مارشل لا میں ایوب خاں کو حاصل ہے۔

بعض معاملات میں جمال انتہاؤں پر کاربند رہتے ہیں۔ کسی کی تعریف کرنے پر آئیں گے تو اسے حسن یوسف، ید بیضا، دم عیسیٰ اور ہر ممکن خوبی سے متصف کر دیں گے اور کسی سے ناراض ہوں گے تو کون سا عیب ہے جو اس میں تلاش نہ کر لیں گے۔ بے پر کی اڑائیں گے تو ایسی کہ بڑے سے بڑا داستان گو بھی پانی نہ پائے اور اگر جھوٹ پکڑ جائے تو فوراً معافی مانگ لیں گے۔ شہر میں کون ہے جو ان کی ان انتہاؤں کا شکار یا ان سے فیضیاب نہ ہوا ہو اور اگر کسی کو ان سے سابقہ نہیں پڑا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جمال نے اسے کسی قابل ہی نہیں سمجھا۔

یہ تو خیر انسانی فطرت کی کمزوری ہے کہ اکثر صورتوں میں ہم وہ دیکھتے ہیں جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں، وہ سنتے ہیں جو سننا چاہتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں جو سمجھنا چاہتے ہیں اور اقدار کے وہ پیمانے بناتے ہیں جن کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے اور ان کے لیے جواز تلاش کرتے ہیں، بہانے ڈھونڈتے ہیں، لیکن جمال کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے چاروں طرف جالے نہیں بنتے، عظمت کے جالے، علم و فضل کے جالے، خوش اخلاقی کے جالے، تنک مزاجی کے جالے، بوہیمیوم کے جالے۔۔۔۔ وہ جیسے ہیں ویسے ہی نظر آتے ہیں اور ان کے لیے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا۔

"دیتا ہے دھوکا یہ بازی گر کھلا"

ایک دن بولے: "انگریزی فلم سے مجھ سے زیادہ کوئی لطف نہیں لیتا۔۔۔!!"

عابد سہیل کو، جن کے بارے میں مشہور ہے کہ "حلقۂ یاراں" میں ان سے زیادہ انگریزی صرف تقی حیدر کو آتی ہے، یہ بات شاید کچھ پسند نہیں آئی اور انھوں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

جمال نے وضاحت کی "فلم دیکھنے کے دوران کسی واقعہ پر لوگ زوروں سے ہنستے ہیں تو میں بھی قہقہہ لگا دیتا ہوں، تھوڑی دیر بعد جب سب خاموش ہو جاتے ہیں تو پاس والی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھتا ہوں کہ لطیفہ کیا تھا اور وہ لاعلمی ظاہر کرتا ہے تو دوسرا قہقہہ لگاتا ہوں، اس کے بعد جب کسی سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہنسنے کی بات کیا تھی تو ایک بار اور قہقہہ لگاتا ہوں، یعنی ایک ٹکٹ میں تین تماشے۔"

جمال کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ خود پر ہنسنا جانتا ہے۔ والد کا انتقال ہوا تو "قومی آواز" سے متعلق ہو چکے تھے، منھ بسورتے ہوئے آئے اور مسیح صاحب سے بولے۔

"ایسے میں کیا کیا کرنا ہوتا ہے؟ مجھے کوئی تجربہ نہیں، پہلا پہلا معاملہ ہے۔"

جمال نے "اودھ پنچ" کو از سر نو زندہ کیا تو درمیانی سائز کا چمڑے کا ایک بیگ ہر وقت ہاتھ میں رہنے لگا۔ اس میں دو چار شمارے ہوتے اور وہ ہر جان پہچان والے کو رسالے کا خریدار بنانے کی کوشش کرتے۔ دوست یاروں سے وانھیں صرف وعدے ہاتھ لگے لیکن سیکڑوں شناساؤں میں سے تھوڑے

بہت خریدار بن گئے۔ حضرت گنج میں مقیم اپنے ایک شناسا کے یہاں بھی اسی مقصد سے گئے۔ انھوں نے نہایت خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔ خوب عمدہ ناشتہ کرایا اور اپنی کار سے امین آباد تک انھیں پہنچا بھی آئے۔ رخصت ہوتے وقت جمال کے چہرے پر زرسالانہ کی درخواست کے مثبت جواب کی تمنا پڑھی تو کار موڑتے ہوئے انھوں نے کہا۔ ''پرسوں ملاقات ہوگی۔''

جمال ''پرسوں'' ان کے یہاں پہنچے تو وہ گھر سے نکل ہی رہے تھے۔ نہایت پرجوش خیر مقدم کیا اور کار میں بٹھا کر کوالٹی ریسٹورنٹ لے آئے جہاں انھوں نے آئس کریم، کیک، پیسٹری اور ٹھنڈی کافی سے ان کی ضیافت کی، لیکن ''اودھ پنچ'' کی سالانہ خریداری قبول کرنے کا سوال اپنی جگہ قائم رہا۔ یہ سلسلہ کئی ہوٹلوں، سنیما گھروں اور ضیافتوں سے ہوتا ہوا ڈیڑھ دو مہینے بعد اس وقت ختم ہوا جب ایک دن انھوں نے کہا۔

''بھائی جمال! میں سالانہ خریدار بننے کا قائل نہیں۔ ویسے تم ہر مہینے پچیس تیس روپے لے لیا کرو۔''

اس وقت ''اودھ پنچ'' کا زرسالانہ زیادہ سے زیادہ چار روپے رہا ہوگا۔

جمال نے اس کوچے میں دوبارہ قدم نہیں رکھا۔

بعض حالات نے جمال کو تالا کھولنے کا ماہر بنا دیا تھا لیکن کسی دوست یا حاجت مند کی مشکل کشائی اور گھر کے نعمت خانے سے کسی بھوکے دوست کے لیے کھانا کھانے کی مجبوری کے علاوہ انھوں نے اس مہارت سے کبھی کام نہیں لیا۔

''قومی آواز'' میں ان کی ڈیوٹی رات کی تھی، دن میں یوں ہی دفتر پہنچے تو دیکھا کہ ادارتی کاموں سے متعلق سارا عملہ ادھر ادھر ٹہل رہا ہے کیوں کہ ہر کمرے پر تالا لٹکا ہوا ہے اور ''ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں'' والی صورت کے بغیر ہی چابی کھو گئی ہے۔ دوسرا چپراسی بھیج کر مدار بخش کو گھر سے بلایا گیا تو معلوم ہوا کہ چابی کا گچھا انھوں نے حسب دستور ٹائم آفس میں دے دیا تھا۔ رجسٹر کے اندراجات بھی ان کے دعوے کی تصدیق کرتے تھے۔ جمال اس وقت پہنچے تھے جب تالے توڑنے کا فیصلہ تقریباً کیا جا چکا تھا۔ ان کی فرمائش پر کہیں سے کوئی ایک ذرا لمبی کیل لے آیا۔ جمال ایک ایک تالے کو اپنے بائیں ہاتھ میں لے کر اس پر داہنے ہاتھ کی بیچ کی انگلی موڑ کر ہڈی سے باری باری ضرب دیتے اور اس عمل سے پیدا ہونے والی آواز کان لگا کر سنتے۔ پھر چابی کی جگہ میں کسی مخصوص زاویے سے کیل داخل کرتے اور آن کی آن میں تالا کھل جاتا۔ بمشکل چار منٹ میں تین موٹے موٹے تالے ''ٹوٹے ہوئے پیمانوں'' کی طرح اپنی عظمت رفتہ پر آنسو بہا رہے تھے۔

کسی نے ان کے اس ''فن'' کی تعریف کی تو مسکرا کر بولے۔

''چھوٹے موٹے تالے کو بس پانچ منٹ گھور کے دیکھوں تو خود بخود کھل جائے اور کیل کی ضرورت بھی نہ پڑے''۔ اور اپنے حساب سے بات ختم کردی۔

جمال بہت بڑے سوشلسٹ ہیں لیکن پارٹی والے نہیں، بلکہ جو چیز جس کے پاس ہونا چاہیے وہ اس تک پہنچانے والے۔

یونیورسٹی میں کیشیئر آفس کے سامنے عارف نقوی نے عابد سہیل سے قلم مانگا تو انھوں نے جیب سے نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔ عارف نقوی نے فارم کی خانہ پری کر کے قلم واپس کر دیا۔ اور دونوں دھیرے دھیرے لائبریری کی طرف بڑھنے لگے لیکن عارف نقوی خلاف معمول خاموش ہیں۔

''کیا بات ہے؟'' عابد سہیل نے پوچھا، جس کا جواب انھوں نے خاموشی سے دیا۔ آخر بے حد اصرار کے بعد انھوں نے صرف اتنا کہا۔

''یہ قلم آپ کا ہے؟''

''نہیں، جمال نے دیا ہے۔ کیوں کیا بات ہے؟''

عارف نقوی نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن عابد سہیل کو شبہ ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے، آخر ان کے بار بار پوچھنے پر عارف نقوی نے تسلیم کر ہی لیا کہ یہ قلم ان کا ہے۔ اتفاق سے اسی وقت جمال بھی کہیں سے آ نکلے۔ انھیں دیکھتے ہی عابد سہیل کے غصے کا پارہ ایک دم اونچا ہو گیا۔

''تم نے عارف نقوی کا قلم مجھے کیوں دے دیا تھا؟'' وہ گرجے۔

''قلم؟'' جمال ہنسنے لگے۔ پھر عارف نقوی کی طرف مخاطب ہو کر بولے ''اس کے کس کام کا ہے؟''

لیکن اگلے ہی جملے میں انھوں نے ''اس کے'' کو ''تمھارے'' سے تبدیل کر دیا۔

''تمھارا کام تو معمولی سے قلم سے بھی چل جائے گا۔ ایسا قلم تو استاد کے پاس ہونا چاہیے، سو میں نے انھیں دے دیا۔''

جب سے عابد سہیل نے ان کے ابتدائی مضامین اشاعت سے قبل الٹ پلٹ کے دیکھے تھے، وہ انھیں استاد ہی کہتے تھے۔

جمال کی اس ہٹ دھرمی پر عارف نقوی اور عابد سہیل دونوں ہی ہنس دیے اور قلم اس کے مالک کو واپس مل گیا۔ یہ قلم پارکر کمپنی کا تھا۔

جمال کی بیوی انھیں رخصت کرا کے اپنے مائکے یعنی سیوان (بہار) لے جانے لگیں تو شہر کے ادیبوں نے چار باغ اسٹیشن پر انھیں نم اور چھلکتی ہوئی آنکھوں سے رخصت کیا۔ جمال سنجیدہ اور کسی قدر اداس اور دل گرفتہ شاید پہلی بار نظر آئے۔ انھیں اس حالت میں پہلے کسی نے کم ہی دیکھا تھا۔ ایسا نہیں کہ انھیں پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو، لیکن انھیں بڑے سے بڑے غم اور پریشانی کو مسکراہٹوں میں بدل دینے کا گر آتا ہے۔ اس کے باوجود ان کا یہ گر بھی اس وقت کام نہ آیا جب ان کے گھر پر حلیم کو ذلیل کیا گیا اور احتجاجاً انھوں نے تاج ریسٹورنٹ میں چائے کی پیالی میں زہر گھول کر خودکشی تک کرنے کی کوشش کی۔ اسپتال لے جائے گئے، طبی سہولت فوراً فراہم ہو جانے سے جان

بچ گئی اور یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین کے صدر کی کوششوں سے پولیس کو مداخلت کا موقعہ بھی نہ مل سکا۔ اس واقعہ پر تاج ہوٹل کے مالک کا یہ جملہ۔۔۔۔'' جمال کو جان دینے کے لیے کوئی اور ٹھور ٹھکانہ نہیں ملا۔ آدھے گھنٹے کی بکری ماری گئی'۔۔۔۔ یاد کر کر کے جمال اکثر و بیشتر ہنستے تھے۔

ان کے لیے سیوان منتقل ہونے کا فیصلہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ مہینوں سوچتے رہے۔ ''قومی آواز'' سے مستعفی ہونے کے لیے خط لکھتے۔۔۔۔ بار بار پڑھتے۔۔۔۔ پھر یہ خط کئی کئی دن تک جیب میں پڑا رہتا اور آخر کار پھاڑ کر پھینک دیا جاتا۔ کبھی ہنستے ہنستے یکا یک خاموش ہوجاتے۔۔۔ لیکن ہوا وہی جو ان کی اہلیہ نے چاہا۔

جمال سیوان چلے تو گئے لیکن لکھنؤ کو بھلا نہ سکے۔ اپنے دوستوں کے نام خطوط اور ہر سال پندرہ بیس دن شہر میں قیام کے ذریعے، جس کی نوبت کبھی کبھی ساتویں آٹھویں مہینے بھی آجاتی، انھوں نے اپنی علمی اور ادبی کارگاہ سے زندہ رشتہ استوار رکھا۔ لکھنؤ آتے تو محسوس ہوتا جیسے یہاں سے کبھی گئے ہی نہ تھے، ایک ایک دوست سے ملاقات کرتے، گپ بازیاں ہوتیں، قہقہے لگتے، امین آباد میں ان کے پسندیدہ ہوٹلوں۔۔۔۔ تاج اور سندر سنگھ۔۔۔ اور حضرت گنج کے کافی ہاؤس میں ان کے دوستوں کا جمگھٹا لگ جاتا۔

لکھنؤ آتے تو خالی ہاتھ لیکن واپسی میں کتابوں کے دو تین بنڈل ضرور ان کے ساتھ ہوتے۔ دوسری کتابوں کے ساتھ طنز و مزاح سے متعلق ہر کتاب جو ان کی ذاتی لائبریری میں نہ ہوتی، خرید کر لے جاتے۔۔۔۔ کچھ نہ کچھ کتابیں دوستداری میں بھی خرید لیتے۔

اور پھر انھوں نے مزاحیہ ادب سے متعلق سیوان میں ہی ''احمد جمال پاشا انسٹی ٹیوٹ'' قائم کیا جس سے مستفیض ہونے کے لیے سارے ملک بلکہ بیرون ملک تک سے اسکالر آتے رہتے۔

اہلیہ کی معیت میں فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے روانگی سے چند روز قبل انھوں نے عابد سہیل کو خط لکھا۔

''یا امیر المشککین! حج کرنے جارہا ہوں۔ آپ کے لیے دعا کروں گا کہ خدا آپ کے ارادوں کو پائے استقامت سے سرفراز فرمائے۔ ویسے ان دنوں ہوم ورک بہت کرنا پڑ رہا ہے۔''

ان کا خط پڑھ کر عابد سہیل کو وہ تصویر یاد آگئی جس میں چالیس پینتالیس سال قبل کے لکھنؤ کا ایک نوجوان لندن میں کارل مارکس کی قبر پر دعا مانگ رہا تھا'' یا اللہ مسلمانوں کو مارکس کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔''

یہ دعا تصویر کی پشت پر درج تھی جسے پڑھ کر ہم لوگ خوب ہنسے تھے لیکن رضیہ آپا نے تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا تھا ''تحقیق طلب امر یہ ہے کہ مارکس کی قبر پر یہ وینٹی بیگ کس خاتون کا رکھا ہوا ہے۔''

سیوان واپس جانے سے پہلے ملنے آئے تو معمول کے برخلاف صرف پندرہ بیس منٹ بیٹھے اور اکھڑے اکھڑے لہجے میں بات کرتے رہے، دس ہی منٹ کے بعد اٹھنے لگے تو میں نے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کے بٹھا دیا۔ باتیں اس کے بعد بھی کیں لیکن ان میں نہ کوئی طنز تھا نہ مزاح، نہ تازگی جو ان کی شخصیت سے عبارت تھے۔ نہ کوئی جملہ بازی کی، نہ کوئی بے ضرر جھوٹ (White lie) ہی بولا۔ پھر یکا یک ''اب چل چلاؤ ہے'' کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کے منہ سے یہ جملہ سن کر تو میں کانپ ہی اٹھا۔ ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکل سکا۔ گفتگو کے اس حیرت خیز موڑ کے اثر سے خود کو آزاد کرنے کے لیے ان کے ساتھ باہر تک چلا آیا اور ''مکتبۂ دین و ادب'' کے پاس بجلی کے کھمبے کو سہارا دینے والے موٹے سے تار کے پاس کھڑے کھڑے تقریباً آدھ گھنٹے تک ان سے بات کرتا رہا۔ اسی رات جمال سیوان چلے گئے لیکن جب بھی ان کا جملہ یاد آتا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔

ماضی اور حال کی یہ دھوپ چھاؤں اب ختم کرنی ہی ہوگی کہ سفاک حقیقت سے کوئی کب تک چشم پوشی کرسکتا ہے۔

چند ماہ بعد اخبار کے ذریعے ان کے انتقال کی خبر ملی، دل نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ آنکھوں نے جو کچھ پڑھا اس پر چند لمحوں تک یقین ہی نہ آیا۔ جمال ایسے خوش مزاج اور ہنس مکھ شخص کو بھی دل دھوکا دے سکتا ہے، کون مان سکتا تھا، لیکن کوئی خود کو کب تک دھوکا دیتا؟

تفصیلات بعد میں معلوم ہوئیں۔ ایک عرصے سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے، لیکن گھر میں کسی کو بھنک نہیں لگنے دی تھی۔ دوائیں برابر لیتے رہتے تھے لیکن بیماری کا علم انھوں نے اہلیہ تک کو نہیں ہونے دیا تھا۔

اردو اکادمی (قیصر باغ) کے ہال میں معینہ وقت سے بہت پہلے ہی آنے والوں کا تانتا بندھ گیا اور تعزیتی جلسہ شروع ہونے سے قبل ہی وسیع ہال اور داہنی جانب کی چھت ان کے مداحوں، ادیبوں، شاعروں اور ادب سے دلچسپی لینے والوں سے چھلک پڑی۔ بعد میں آنے والوں کو گیلری میں بمشکل کھڑے ہونے بھر کی جگہ مل سکی۔

مجاز کے انتقال کے بعد شہر نے کسی ادیب کا ایسا پر ہجوم تعزیتی جلسہ پہلی بار دیکھا۔ شاید ہی کوئی مقرر ہو جس کی آنکھوں میں آنسو نہ تیر آئے ہوں، بعض تو بمشکل چند الفاظ ہی ادا کر سکے۔

شمس الرحمٰن فاروقی — ہماری مطبوعات — ''تنقیدی افکار'' سے اقتباس

نظم کیا ہے؟

اس سوال کا مدعا یہ معلوم کرنا نہیں ہے کہ وہ چیز کیا ہے جسے نظم (یعنی منظوم کلام) کہتے ہیں۔ یعنی اس سوال کا مقصد یہ نہیں ہے کہ نظم کی وجودیات (Ontology) سے بحث کی جائے۔ نظم بامعنی ہوتی ہے کہ نہیں؟ نظم کے معنی اس کے اندر ہوتے ہیں یا باہر؟ نظم کے موضوع کو اس کے معنی کہہ سکتے ہیں کہ نہیں؟ نظم کے ذریعے ہمیں علم حاصل ہوتا ہے یا تجربہ؟ اگر تجربہ، تو اس تجربے کو کسی طرح کا علم (یعنی ایسی معلومات جس کی روشنی میں عام احکامات لگائے جاسکیں) کیوں نہیں کہہ سکتے؟ اگر نہیں، تو کیا نظم میں جو کچھ بیان ہوتا ہے اس کا سچ ہونا بھی ضروری نہیں؟ اور اگر نہیں تو پھر نظم کے صحیح پن (Validity) کے لیے ہمارے پاس کیا دلائل ہیں؟ پھر نظم میں جو بات بیان ہوتی ہے کیا وہ بات اور نظم کا لفظی بیان ایک ہی حکم رکھتے ہیں؟ وغیرہ ان سوالات کا تعلق صرف نظم سے نہیں بلکہ پوری شاعری سے ہے۔ ان کے برخلاف سوال ''نظم کیا ہے'' کے ذریعے میں چند مباحث ایسے چھیڑنا چاہتا ہوں جن کا تعلق صرف اس صنف سخن سے ہے جس کو ہم اردو والے ''نظم'' کہتے ہیں۔ یعنی میری بحث ''نظم'' نامی صنف سخن کی شکلیات (Morphology) اور شناسیات (Taxonomy) سے ہوگی۔

میں یہ مان کر چلتا ہوں کہ بعض بنیادی باتوں پر ہم سب کا اتفاق ہے۔ مثلاً ہم سب تسلیم کرتے ہیں کہ اقبال کا ''مرثیۂ داغ'' مرثیہ ہے اور نظم بھی ہے۔ لیکن یہ اس طرح کا مرثیہ نہیں ہے جس طرح کا مرثیہ مثلاً میر انیس لکھتے تھے۔ جس سوال کے جواب پر ہمارا اتفاق شاید نہ ہو، وہ یہ ہے کہ اگر ''مرثیۂ داغ'' از اقبال، اور ''درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے'' از غالب دونوں مرثیے ہیں تو کیا یہ دونوں ایک ہی طرح کی نظم بھی ہیں یا نہیں؟ اسی طرح اس سوال کے جواب پر بھی اتفاق شاید نہ ہو کہ اگر اقبال کا ''مرثیۂ داغ'' مرثی ہے اور نظم بھی ہے، تو کیا میر انیس کے مرثیے بھی نظم ہیں؟ اسی طرح ہم سب تسلیم کرتے ہیں کہ سنائی کے اتباع میں لکھی ہوئی اقبال کی تخلیق (سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا) نظم ہے۔ لیکن جس سوال کے جواب پر اتفاق شاید نہ ہو، وہ یہ ہے کہ اگر یہ نظم سنائی کے قصیدے کے طرز پر لکھی گئی ہے تو اسے قصیدہ کیوں نہ کہا جائے؟ اور اگر ترکی ایرانی طرز پر ایک طویل طنزیہ شہر آشوب لکھ کر سودا نے اسے ''قصیدہ در تضحیک روزگار'' کا نام دے دیا تو کیا یہ ضروری ہے کہ ہم بھی اس کو قصیدہ کہیں؟ یا اگر فرض کیجیے کہ ہم اسے قصیدہ نہ کہیں، شہر آشوب کہیں، تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہر آشوب نظم ہے اور قصیدہ نظم نہیں ہے، صرف قصیدہ ہے؟ لیکن ایک سوال یہ بھی ہے کہ آیا کسی تحریر کی قسمیات (Typology) کا دارومدار شاعر کے عندیے پر ہے؟ یعنی اگر سودا نے اپنی ایک منظوم تحریر کو قصیدے کا نام دیا تو کیا ہم بھی اسے قصیدہ کہنے پر مجبور ہیں؟ اور اگر اقبال نے اپنی ایک منظوم تحریر کو قصیدے کا نام نہیں دیا تو کیا ہم بھی اس بات پر مجبور ہیں کہ ہم اس کو قصیدہ نہ کہیں، چاہے اس تحریر میں قصیدے کے معروف عناصر موجود ہوں؟ اگر ایسا ہے تو ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ اقبال کی چار مصرعے والی ان اردو فارسی نظموں کو جو مفاعیلن مفاعیلن فعولن کے وزن پر ہیں، رباعی کہیں، کیونکہ اقبال نے انھیں رباعی ہی کہا ہے۔ اسی طرح ہم اس بات پر بھی مجبور ہیں کہ حالی کے مرثیۂ دہلی کو شہر آشوب نہ کہیں بلکہ غزل کہیں کیونکہ انھوں نے اسے شہر آشوب کا عنوان نہیں دیا ہے اور یہ منظومہ ان کے کلیات غزلیات میں درج ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر کو اپنے کلام کی قسمیات متعین کرنے کا کچھ حق تو ہوتا ہے، لیکن اسے اس قدر حق ہم نہیں دے سکتے کہ وہ مروج یا مقبول اقسام کو من مانے ناموں سے پکارے اور ہر بار ہمیں اس دردسر میں مبتلا ہونا پڑے کہ اگر اقسام کا تعین شاعر ہی کرتا ہے تو اقسام کی ضرورت کیا ہے؟ جس شاعر کا جو جی چاہے کرے، اپنی ایک تخلیق کو قصیدہ کہے اور اسی طرح کی دوسری تخلیق کو مثنوی کہے، تیسری کو غزل کہہ دے لیکن یہاں یہ مشکل ہے کہ ہر قسم کے شعر کے ساتھ مختلف طرح کی توقعات وابستہ ہوگئی ہیں اور قاری ان توقعات کی روشنی میں ہی ہر تخلیق کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ احتشام صاحب مرحوم نے اپنی ایک یاس آلود غزل کو اسی لیے ''بہ یاد و یت نام'' کا عنوان دے دیا تھا کہ قاری اسے ان توقعات کی روشنی

● شمس الرحمن فاروقی کے مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1983 میں شائع ہوا تھا۔ 1986 میں اس کتاب کو ساہتیہ اکادمی نے انعام سے نوازا۔ اس مجموعے میں نظری تنقید، نظریۂ نقد اور مشرق و مغرب کی شعریات کے تحت اہم مضامین شامل ہیں۔ تین نئے مضامین کے اضافے کے ساتھ کونسل نے اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ 348 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 148 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

میں نہ پڑھے جو غزل کے ساتھ وابستہ ہیں اور جن کی روشنی میں وہ تخلیق غیر ترقی پسند ٹھہر سکتی تھی۔

اقسام شعر کے ساتھ جو توقعات وابستہ ہوگئی ہیں ان کی بنیاد کچھ تو خود ان اقسام پر ہے اور کچھ ان اقسام کی وضاحت کرنے والوں پر۔ یعنی جب بے ربط لیکن ہم قافیہ اشعار پر مشتمل ایسی بہت سی تحریریں سامنے آئیں جن میں حسن و عشق کا تذکرہ تھا اور ان کو غزل کا نام دیا جاتا رہا، تو ہم نے یہ توقع وابستہ کرلی کہ غزل وہ تحریر ہے جس میں عشقیہ مضامین والے ہم قافیہ لیکن بے ربط اشعار ہوتے ہیں۔ دوسری طرف فارسی اقسام شعر کی وضاحت کرنے والوں نے بعض بلند آہنگ، تعریفی یا شخصی یا اخلاقی مربوط اشعار والی نسبتاً طویل تحریروں کو قصیدے کا نام دے دیا، حالانکہ عربی میں (جہاں سے یہ لفظ اور اصطلاح ماخوذ ہے) قصیدہ نام کی کوئی صنف سخن ہے ہی نہیں۔ لیکن چونکہ اقسام شعر پر لکھنے والوں نے ایک خاص طرح کی نظموں کو قصیدہ کہہ دیا، اس لیے لفظ قصیدہ سے ایک خاص طرح کی توقعات وابستہ ہوگئیں۔

مشکل تب پیدا ہوتی ہے جب شاعر، یا اقسام شعر پر لکھنے والا کوئی شخص، کسی رائج قسم شعر پر وہ توقعات عائد کرنا چاہتا ہے جو اس سے اب تک وابستہ نہ تھیں۔ اگر وہ توقعات پچھلی رائج توقعات سے بالکل متغائر ہوں تو انتشار اور افراتفری اور غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور اگر وہ توقعات پچھلی رائج توقعات سے کسی نہ کسی طرح کی ہم آہنگی رکھتی ہوں تو آہستہ آہستہ نئی توقعات بھی رائج ہوجاتی ہیں۔ کلیم الدین صاحب نے غزل پر وہ توقعات عائد کرنا چاہیں جو پچھلی رائج توقعات سے بالکل متغائر تھیں اور چونکہ کلیم الدین صاحب نے اپنی بات بڑے حتمی انداز میں، اور مغربی ادب کے حوالوں سے کہی اور ان کے زمانے میں مغربی (بلکہ انگریزی) ادب کے اصول بڑے مقدس اور محترم تھے، اس لیے کلیم الدین صاحب کی بات سے غیر معمولی انتشار پیدا ہوا اور اس کے اثرات اب تک باقی ہیں۔ اس معنی میں کہ لوگ اب تک یہ کوشش کرتے ہیں کہ کلیم الدین صاحب کا لگایا ہوا الزام غلط ثابت ہوجائے اور غزل میں اس ربط و انتظام کا وجود ثابت کیا جائے جو کلیم الدین صاحب کے بقول نظم کی شاعری (یعنی بڑی شاعری) کا خاصہ ہے۔ ہماری منفعل ذہنیت کو اپنی گناہ گاری کا اس درجہ یقین تھا کہ ہم لوگوں نے یہ بھی غور نہ کیا کہ کیا مغربی ادب میں نظم کا واقعی وہی تصور ہے جو کلیم الدین صاحب بیان کررہے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ مغربی ادب میں نظم کا کوئی ایک تصور نہیں ہے، ہو بھی نہیں سکتا اور وہ تصور جسے کلیم الدین صاحب نے حتمی کلیے کے طور پر بڑے شدومد سے پیش کیا، مغرب میں نظم کا بنیادی تصور نہیں ہے۔ لیکن کلیم الدین صاحب کے سامنے صف آرا ہونے والوں نے اس سے بڑی غلطی یہ کی کہ انھوں نے یہ فرض کرلیا کہ اقسام شعر کے بارے میں ہمارے تصورات صرف اس لیے غلط اور خام اور غیر ترقی یافتہ ہیں کہ مغرب میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔

ان نکات پر تفصیلی بحث بعد میں ہوگی۔ فی الحال شروع والی باتوں کا سلسلہ پھر قائم کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ (1) میں یہ فرض کررہا ہوں کہ غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی وغیرہ میں عام طور پر فرق کرنا ممکن ہے۔ اختلاف ان باتوں پر ہوسکتا ہے کہ انیس کے مرثیے نظم ہیں کہ نہیں، سودا کا شہر آشوب قصیدہ ہے کہ نظم ہے۔ سنائی کے اتباع میں اقبال کی نظم قصیدہ ہے کہ نہیں؟ اختلاف اس بات پر بھی ہوسکتا ہے کہ قصیدہ، مرثیہ، مثنوی وغیرہ نظم ہیں کہ نہیں؟ (2) شاعر کو تھوڑا بہت حق ہے کہ وہ اپنی تخلیق کی قسمیات متعین کرے لیکن اس کو پورا پورا حق نہیں ہے۔ کیونکہ قسمیات کی بنیادی شرط وہ توقعات ہوتی ہیں جو ہر قسم کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ (3) اگر ہم کسی قسم کے شعر کے اوپر کسی نئی طرح کی توقع عائد کرنا چاہیں تو ان کے نتیجے میں انتشار ممکن ہے۔

اب میں فی الحال یہ اصول قائم کرتا ہوں: ہر وہ منظوم تحریر جو غزل نہیں ہے وہ نظم ہے۔ یہاں میں نثری نظم کو بھی منظوم تحریر کی نوع میں رکھ رہا ہوں اور اگر کوئی ڈراما منظوم ہے یا اس کے کچھ حصے منظوم ہیں تو ان منظوم حصوں کی حد تک وہ ڈراما بھی نظم ہے۔ دوسرا اصول یہ ہوسکتا ہے کہ نظم وہ منظوم تحریر ہے جو غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، واسوخت، شہر آشوب، مسمط، ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد نہ ہو۔ یعنی نظم وہ منظوم تحریر ہے جس پر ان اقسام میں سے کسی ایک کا بھی حکم نہ لگایا جاسکے جو ہمارے یہاں عہد قدیم سے رائج ہیں۔ اگر یہ سوال ہو کہ ایسا ہے تو پھر محمد قلی قطب شاہ اور میر و نظیر کی ان تحریروں کا کیا بنے گا جنھیں موضوع کی بنا پر ہم نظم کہتے آئے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان تمام شعرا کی کوئی منظوم تحریر ایسی نہیں ہے جسے مندرجہ بالا کسی بھی نوع (Category) میں نہ رکھا جاسکے۔ مسمط، ترکیب بند، ترجیع بند ایسی انواع ہیں جن میں ہر وہ چیز آسکتی ہے جو مثنوی، غزل، قصیدہ یا رباعی نہ ہو۔ پرانے زمانے کے لوگ اپنی اس طرح کی تحریروں کی پہچان اسی طرح کرتے بھی تھے۔ مثلاً میر کا ''مخمس درہجو شہر کاما'' یا جرأت کا ''مخمس شہر آشوب درہجو نوشاعراں'' وغیرہ۔ لیکن اس تعریف میں مشکل یہ ہے کہ بہت سا ایسا کلام، جسے ہم مسدس، ترکیب بند، مثنوی وغیرہ نہیں کہنا چاہتے، بلکہ نظم کہنا چاہتے ہیں، نظم کے دائرے سے خارج ہوجائے گا۔ مثلاً کون ہے جو ''ذوق وشوق'' کو ترکیب بند اور ''گورستان شاہی'' کو مثنوی کہنا پسند کرے؟ اس میں دوسری مشکل یہ ہے کہ ہم اقسام شعر کی تعداد غیر ضروری طور پر بڑھانے پر مجبور ہوجائیں گے اور بات پھر بھی مکمل نہ ہوگی۔ چار مصرعے والے بندوں پر مشتمل تحریر کو مربع اور پانچ مصرعے والے بندوں پر مشتمل تحریر کو مخمس، چھ والی کو مسدس، سات والی کو مسبع کہیے اور پندرہ والی کو کوئی اور نام دیجیے، بارہ والی کو کوئی اور نام دیجیے۔ ان سب کو ملا کر مسمط کہا جاسکتا ہے، لیکن مسمط محض ایک لیبل ہے، اس سے کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ نظم کے بند کتنے مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ پھر نئے اصناف کو کیا کریں گے؟ مثلاً دوہے کو کیا کہیں گے؟ مثنوی کہہ

نہیں سکتے۔ مثنوی کا شعر یا غزل کا مطلع کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مثنوی کا شعر یا غزل کا مطلع صنف سخن تو ہوتے نہیں لہٰذا دوہے کو نظم ہی کہنا ہوگا۔ گیت بھی نظم کہلائے گا۔ سانیٹ اور ہائیکو کو ہم نظم کہتے ہی ہیں۔ یعنی ہرنئی آنے والی ہیئت یا صنف شعر نظم کہلائے گی۔ لیکن پھر اس تعریف میں (یعنی نظم وہ منظوم تحریر ہے جو غزل، قصیدہ، مسمط وغیرہ نہ ہو) اور پہلی تعریف میں (یعنی ہر وہ منظوم تحریر جو غزل نہیں ہے، وہ نظم ہے) کوئی خاص فرق نہیں رہ جاتا۔ کیونکہ قصیدہ، مثنوی، مستزاد وغیرہ تقریباً ازکار رفتہ ہو چکے ہیں اور ''گورستان شاہی'' جیسی تحریروں کو ہم مثنوی کہنا نہیں چاہتے۔ لہٰذا یہ تفریق بے معنی ہو جاتی ہے کہ صاحب وہ منظومات جو ان انواع کے خانے میں نہیں آتیں جو ہمارے یہاں پہلے سے مروج ہیں، نظم ہیں۔ باقی سب کے الگ الگ نام ہیں یعنی مخمس، مسدس، قصیدہ، مثنوی وغیرہ۔ کیونکہ مخمس، مسدس، قصیدہ، مثنوی وغیرہ کو تو ہم پہلے ہی ترک کر چکے ہیں، یہاں تک کہ حالی کا ''مسدس'' بھی اپنے نام کے باوجود نظم ہی کہا جاتا ہے، لہٰذا وہ تفریق جس پر ہم خود عمل پیرا نہ ہوں، ہمارے کسی کام کی نہیں۔

ایک بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ نظم کی بعض خاص صفات ہوتی ہیں، جن منظومات میں وہ صفات ہوں گی، ہم انھیں نظم کہیں گے، عام اس سے کہ وہ کس ہیئت میں ہے یا ان کو کس رائج یا قدیم نوع میں رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً ''گورستان شاہی'' مثنوی کی ہیئت میں ہے، لیکن ہمیں وہ نظم معلوم ہوتی ہے اور اقبال کا ''ساقی نامہ'' مثنوی کی ہیئت میں بھی ہے اور مثنوی کی صفات بھی رکھتا ہے۔ اسی طرح اقبال کا مرثیۂ داغ اگرچہ مرثیہ ہے لیکن نظم کی صفات رکھتا ہے اور غالب کا ''درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے'' اگرچہ مرثیہ ہے لیکن غزل کی صفات رکھتا ہے اس لیے ہم اسے غزل کہیں گے۔

یہ جواب بظاہر بہت بااصول معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں بہت سے خطرات پنہاں ہیں۔ بالکل سامنے کی بات لیجیے۔ وہ کون سے صفات ہیں جنھیں ہم نظم کے صفات کہتے ہیں اور جن کی بنا پر ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' اور ''گورستان شاہی'' مثنوی کی ہیئت میں ہوتے ہوئے بھی نظم ہیں اور ''ساقی نامہ'' کو ان صفات سے خالی ہونے کی بنا پر ہم مثنوی کہتے ہیں؟ اس کا جواب کلیم الدین صاحب سے مانگیے تو مایوسی ہوگی کیونکہ کلیم الدین صاحب کے خیال میں نظم مربوط خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے اور ''والدہ مرحومہ کی یاد میں''، ''گورستان شاہی'' اور ''ساقی نامہ'' تینوں ہی مربوط خیالات کا مجموعہ ہیں۔ اس کا جواب مولوی عبدالرحمن اینڈ کمپنی سے مانگیے تو بھی مایوسی ہوگی۔ کیونکہ وہ آپ کو بتائیں گے کہ مثنوی کے لیے بعض بحریں مخصوص ہیں اور ''گورستان شاہی'' اور ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' بحر رمل مثمن محذوف میں لکھی گئی ہیں اور یہ بحر ان بحروں میں نہیں ہے جو مثنوی کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ جواب اس لیے غلط ہے کہ مثنوی کے لیے کوئی بحر مخصوص نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اکثر مثنویاں آٹھ بحروں میں سے کسی ایک میں لکھی گئی ہیں لیکن میر سے لے کر شوق قدوائی تک (بلکہ حفیظ جالندھری تک) ایسے شعرا موجود ہیں جنھوں نے آٹھ بحروں کے باہر بھی مثنویاں لکھی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ مثنوی میں ایک خاص طوالت ہوتی ہے، تو سوال یہ ہوگا کہ کتنی طوالت؟ جمیل مظہری کی ''آب وسراب'' میں چار سو شعر ہیں، لیکن ہم سب اسے مثنوی کہتے ہیں اور اقبال کی زیر بحث نظموں میں اشعار کی تعداد حسب ذیل ہے: ''گورستان شاہی'' 58، ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' 86، ''ساقی نامہ'' 99۔ لہٰذا ''ساقی نامہ'' اور ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' تقریباً ایک سی طوالت کی حامل ہیں۔ میر کی ''مثنوی در مذمت دنیا'' میں 50 شعر ہیں اور ''خواب و خیال میر'' میں 140۔ لہٰذا اقبال کی زیر بحث نظمیں بھی مثنوی کی صفت طوالت سے متصف ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ ''ساقی نامہ'' کی فضا قدیمی اور مثنویانہ ہے اور ''گورستان شاہی'' اور ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کی فضا جدید اور غیر مثنویانہ ہے تو میں یہ سوال نہ اٹھاؤں گا کہ جدید اور غیر مثنویانہ فضا سے آپ کی کیا مراد ہے؟ میں یہ بھی نہ پوچھوں گا کہ خاقانی کے قصیدے ''ہاں اے دل عبرت بیں ہیں از دیدہ نظر کن ہاں'' جس کی فضا اس قدر جدید ہے کہ فراق صاحب نے بھی اس کی نقل کی ہے اور سنائی کے قصیدے ''مکن در جسم و جاں منزل کہ ایں دونست و آں والا'' جس کا اتباع اقبال نے کیا ہے، ان کی فضا کی جدیدیت کے پیش نظر اب ان کو بھی نظم کیوں نہیں کہہ دیتے؟ آپ کہہ سکتے ہیں کہ فضا کی جدیدیت ایسی صفت نہیں جس کو ہم واضح الفاظ میں بیان کر سکیں، اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ میں یہ بات بھی ماننے کو تیار ہوں لیکن آپ کا مسئلہ پھر وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے کہ جس فضا کی بنیاد پر آپ ایک مثنوی کو نظم اور دوسری مثنوی کو غیر نظم قرار دے رہے ہیں۔ اس کا تعین مختلف زمانوں میں کون کرے گا؟ اور یہ ذمے داری کون لے گا کہ تمام شعری سرمائے کو ان کی ''عمومی فضا'' کے اعتبار سے پرکھ کر فیصلہ کرے کہ سودا کے فلاں فلاں منظومات تو قصیدے ہیں، فلاں شہر آشوب ہیں اور فلاں فلاں نظم ہیں؟ پھر ایسی تفریق جس میں نوع (Category) اور جنس (Class) کے درمیان فرق نہ ہو سکے، نہ عملی طور پر ہمارے کام کی ہے، نہ نظری طور پر۔

میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ اگر ہم دو انواع کے درمیان فرق کو پوری طرح واضح اور ثابت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسا فرق موجود ہی نہیں ہے۔ جان سرل (John Searle) نے یہ بات Deconstructionist نظریات پر بحث میں بعض نئے مسائل کی ضمن میں کہی ہے، لیکن چونکہ اس معاملے کا تعلق تمام اصناف سخن اور فلسفۂ لسان سے ہے، اس لیے اس کا ایک مختصر اقتباس درج کرتا ہوں:

''ادب پر نظریاتی بحث کرنے والوں میں بہت سے لوگ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ افسانے کے کسی نظریے کا یہ کوئی بنیادی عیب نہیں ہے

کہ وہ افسانہ اور غیرافسانہ کے درمیان کوئی واضح فرق نہیں قائم کرتا، یا استعارے کے بارے میں کسی نظریے کا یہ کوئی بنیادی عیب نہیں ہے کہ وہ استعاراتی اور غیر استعاراتی بیان کا فرق صفائی سے نہیں بیان کرسکتا۔ کسی غیر قطعی وقوعہ (Phenomenon) کے بارے میں کسی نظریے کے درست اور غیر مبہم ہونے کی شرط ہی یہ ہے کہ وہ اس وقوعہ کو صاف صاف انداز میں غیر قطعی بنائے۔۔۔ (اسی طرح یہ خیال بھی غلط ہے کہ) وہ تصورات جن کا اطلاق ادیب اور زبان پر کیا جائے۔ ان کے صحیح پن کی شرط یہ ہے کہ کسی مشینی طریقے سے ان کی تصدیق بھی ہو سکے۔''

مجھے ایسا لگتا ہے کہ سرل کے ان خیالات سے واقفیت کے بغیر ہی اردو کے بیشتر نقاد حضرات اپنی غیر قطعی، مبہم اور نام نہاد وجدانی رایوں میں سرل کا اتباع کرتے رہے ہیں۔ لیکن وجدانی اور ذوقی احساس اور فیصلہ (جس پر زور دینے کی بدعت ہمارے یہاں شبلی سے شروع ہوئی) اسی وقت کارگر ہوتا ہے جب اس کی پشت پناہی پر منطقی فکر اور معروضی چھان بین بھی ہو صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ نظم میں نظمیت ہوتی ہے اور مثنوی میں مثنوی پن ہوتا ہے۔ ابھی حال میں ایک رسالے میں تبصرہ نگار نے لکھا کہ غالب میں غالبیت ہے اور میر میں میریت ہے اور یہی ان دونوں کا بین فرق سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ عملی دنیا اس سے کچھ زیادہ کا تقاضہ کرتی ہے اور ابھی یہ بات بہرحال ثابت نہیں ہوسکی ہے کہ وہ منظومہ جو قصیدہ ہے اور وہ جو قصیدہ نہیں ہے لیکن اسی ہیئت وطرز میں ہے، ان میں کوئی ایسا فرق ہوتا ہی ہے جس کی بنا پر ہم ایک کو قصیدہ اور ایک کو نظم کہہ سکیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ قصیدہ چونکہ ایک تاریخی چوکھٹے میں جکڑی ہوئی (Fixed) اصطلاح ہے، اس لیے بعض منظومات (مثلاً اقبال کا اتباع سنائی) کو قصیدہ کہنا ان کی معنویت کو ایک مخصوص اور کبھی کبھی غلط سمت دے سکتا ہے۔ اس کے برخلاف قصیدے کو نظم کہنے میں کوئی مشکل یا قباحت نہیں۔ کیونکہ نظم Neutral اصطلاح ہے اور اس کے استعمال سے فن پارے کے معنی کو کسی تاریخی فریم میں جکڑ جانے کا خطرہ نہیں رہتا۔ غالب کا مطلع ہے:

جادۂ رہ خور کو وقت شام ہے تار شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہ نو سے آغوش وداع

اس پر طباطبائی نے کہا ہے کہ اس مضمون میں کچھ غزلیت نہیں ہے۔ قصیدے کا مطلع تو ہوسکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ طباطبائی کے خیال میں قصیدے کی تشبیب کو براہ راست غزل نہیں فرض کرسکتے۔ یعنی قصیدے میں ایک قصیدہ پن ہوتا ہے جو تشبیب میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اس خیال سے اختلاف ممکن ہے لیکن کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظم میں کوئی نظم پن بھی ہوتا ہے جو نظم کو قصیدہ، مثنوی، کربلائی مرثیے وغیرہ سے الگ کرتا ہے؟ میرا کہنا ہے کہ قصیدہ اور غزل جیسی واضح فرق رکھنے والی اصناف میں بھی ''غزلیت'' اور ''قصیدہ پن'' کی بنا پر تفریق قائم کرنا مشکل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غالب نے یہ مطلع دیوان غزلیات میں نہ رکھا ہوتا اور حالی نے اپنا شہرآشوب غزلوں میں نہ شامل کیا ہوتا۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ قصیدے میں پرشکوہ الفاظ وغیرہ ہوتے ہیں۔ لیکن محسن کاکوروی کے قصیدے ان نام نہاد پرشکوہ الفاظ سے خالی ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں غزل میں ہلکے اور سادہ الفاظ ہوتے ہیں لیکن ولی اور ناسخ اور غالب اور اقبال کی صدہا غزلیں ان نام نہاد ہلکے اور سادہ الفاظ سے خالی ہیں۔ دراصل غزل اور قصیدے کا فرق موضوع کی طرف شاعر کے رویے پر قائم ہے۔ اعلیٰ درجے کی غزل میں تہ داری اور معنی کی فراوانی اور خیال کی پیچیدگی بھی ہوتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ صفات ہر غزل کے ہر شعر میں ہوتی ہیں۔ ہاں موضوع اور اس کی طرف شاعر کا رویہ، یہ ایسی چیزیں ہیں جو تمام غزل میں مشترک ہیں۔

میرا معروضہ یہ ہے کہ نظم اور قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ میں کوئی داخلی فرق نہیں ہے جیسا کہ غزل اور غیرغزل (مثلاً غزل اور قصیدہ) میں ہے۔ اس کے برخلاف، غزل کے علاوہ تمام دوسری اصناف سخن میں یہ بات مشترک ہے کہ ان کے اشعار میں کسی نہ کسی طرح کا ربط، یا ربط کا التباس ہوتا ہے۔ لہٰذا چونکہ غزل اور دیگر اصناف سخن کے درمیان داخلی اور خارجی دونوں طرح کے بین فرق ہیں اور بہت سے فرق ہیں اور اس کے برخلاف غیرغزلیہ اصناف سخن میں طرح طرح کے داخلی اور خارجی نقطہ ہائے اشتراک ہیں۔ اس لیے ہر وہ منظومہ جو غزل نہیں ہے وہ قصیدہ ہے یا قطعہ۔ اور قصیدے اور قطعے میں بھی عام طور پر فرق طوالت کی بنا پر تھا۔ عربی شعریات میں قصیدے کی حیثیت پر ظفر احمد صدیقی نے بہت عمدہ بحث کی ہے، لہٰذا میں تفصیل کو نظرانداز کرتا ہوں۔ غزل کے علاوہ تمام اصناف سخن کو نظم قرار دینے میں جو فائدے ہیں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ میں کر ہی چکا ہوں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہماری تقسیمات (typology) انتشار سے بچ جائے گی۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی وغیرہ اصطلاحوں کو منسوخ کردیں۔ نہیں، بلکہ یہ اصطلاحیں ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں اور انھیں قائم رہنا چاہیے۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ غزل کے مقابل تمام اصناف کو ہم نظم قرار دیں اور جب ہم نظم کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کریں تو ان تمام اصناف کو نظر میں رکھیں۔

لیکن اگر ہم قصیدہ، مرثیہ وغیرہ کی بھی روشنی میں نظم کی تعریف بنانے بیٹھیں گے تو کلیم الدین صاحب کی بتائی ہوئی تعریف کا کیا ہوگا؟ وہ کہہ سکتے ہیں، اور وہ یہ کہنے میں حق بجانب بھی ہوں گے، کہ آپ کی تعریف سے میری تعریف منسوخ نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظم کی ایک تعریف آپ نے بھی بنائی ہے۔ لیکن میری تعریف کی روشنی میں غزل پر یہ الزام قائم رہتا ہے کہ وہ ایک خام اور غیر ترقی یافتہ صنف سخن ہے۔ کیونکہ اس میں نظم کے وہ صفات نہیں ہیں جو بڑی شاعری کے ضامن ہیں۔ لہٰذا اس

الجھن کو سلجھانے کا بہتر طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کلیم الدین صاحب کے خیالات سے بحث کی جائے۔

اس سلسلے میں سب سے بنیادی اور ہر وقت یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ انگریزی لفظ Poem یا فرانسیسی لفظ Poeme کا اردو ترجمہ ''نظم'' اس صنف سخن کے معنی میں نہیں ہے جسے ہم ''نظم'' کہتے ہیں اور جو غزل سے مختلف چیز ہے اور صنف سخن کی حیثیت سے اپنا مقام رکھتی ہے۔ انگریزی لفظ Poem اور فرانسیسی لفظ Poeme کا صحیح ترجمہ ''منظومہ'' ہوگا۔ یعنی وہ تحریر جس میں غزل، نظم، رباعی وغیرہ سب شامل ہے یعنی مغربی نقاد جب Poeme یا Poem کہتا ہے تو اس میں غزل بھی شامل ہوتی ہے۔ لہٰذا ان لفظوں کا ترجمہ ''نظم'' اس لفظ کے اصلی معنوں میں ہے، یعنی ''وہ تحریر جو نثر نہیں ہے'' ان لفظوں کا ترجمہ ''نظم'' کرنے سے ہم لوگوں کو یہ نقصان ہوا، بلکہ یہ دھوکا ہوا کہ ہم لوگوں نے سمجھا کہ Poem میں غزل شامل نہیں ہے اور اگر کوئی مغربی شخص غزل سے دوچار ہوگا تو اس کو Poem نہ سمجھے گا (ملاحظہ ہو کلیم الدین صاحب کا تمثیلی مضمون ''ایک مغربی سیاح کے خطوط'') لہٰذا ہم لوگوں نے گمان کیا کہ Poem کی جو تعریف ہم نے مغرب میں دیکھی ہے، اگر اس کا اطلاق غزل پر نہ ہو سکے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غزل ایک ناقص اور خام چیز ہے۔ ہم لوگ یہ بھول گئے کہ مغربی قاری جب غزل سے دوچار ہوتا ہے تو وہ اس کو بھی Poem کہتا ہے، یہ اور بات ہے کہ وہ غزل کی جمالیات کو شاید فوری طور پر نہ سمجھ سکے۔ ہم لوگ یہ بھی بھول گئے کہ چونکہ مغربی شعریات کے ارتقائی دور میں مغربی زبانوں میں غزل نہیں تھی، اس لیے اس شعریات میں غزل کے لیے پوری گنجائش واضح طور پر نہ بن سکی۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، کیونکہ عربی میں ڈراما نہ ہونے کی وجہ سے ابن رشد جیسا فلسفی اور ارسطو کا عاشق زار ارسطو کی ''شعریات'' (Poetics) کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ اس کے برخلاف مغرب جو بڑے پیمانے پر غزل سے آشنا ہوا تو جرمن زبان میں Ghasel نامی صنف سخن وجود میں آ گئی۔ اقبال کے دیباچہ ''پیام مشرق'' ہی کا مطالعہ اس حقیقت کو آشکار کرنے کے لیے کافی و شافی ہے۔

لہٰذا بنیادی بات یہ ہے کہ لفظ Poem کے مفہوم میں غزل کا مفہوم شامل ہے، اور مغربی تنقید میں جو تصورات لفظ Poem کے ساتھ وابستہ ہیں ان میں اکثر کا کم و بیش اطلاق غزل پر ہو سکتا ہے۔ بہرحال کلیم الدین صاحب اور ان کی تقلید میں ہمارے بہت سے نقادوں کا خیال یہ ہے کہ نظم (1) مربوط خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے یا (2) اگر اس میں ایک ہی خیال بیان کیا گیا ہو تو اس بیان میں آغاز ترقی اور انتہا کی کیفیت ہوگی۔ کلیم الدین صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ربط اور تسلسل ترقی یافتہ ذہن کی پہچان ہیں، لہٰذا جس اظہار میں ربط اور تسلسل نہ ہوگا وہ غیر ترقی یافتہ ذہن کی تخلیق ہوگا۔

نظم کے لیے جو دو شرطیں مغربی تصورات کے حوالے سے بیان کی گئیں ان پر کئی طرح کے اعتراض عائد ہو سکتے ہیں۔ پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ یہ شرطیں مغربی شعریات میں قطعیت اور وضاحت سے کبھی بیان نہیں ہوئیں۔ لہٰذا یہ دعویٰ غلط ہے کہ یہ شرائط مغربی اصول نقد میں بنیادی اور لازمی حیثیت رکھتی ہیں۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ شرطیں ان نظموں کے لیے بے کار ہیں، جن میں محض ایک تاثر، محض ایک جذبہ یا محض ایک کیفیت بیان کی گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ خود مغربی ادب میں ایسی ان گنت نظمیں ہیں جن میں کوئی خیال نہیں ہے، محض ایک جذبہ، ایک کیفیت، ایک منظر یا ایک تاثر بیان ہوا ہے۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ شرائط ان نظموں کے لیے بھی بے کار ہیں جن میں ایک ہی خیال یا ایک ہی تاثر بار بار بیان کیا گیا ہو۔ ایسی نظموں کو Paratactic کہا جاتا ہے اور ان کی تعداد بھی مغربی ادب میں بہت کثیر ہے۔ چوتھا اعتراض یہ ہے کہ نظم کے خیال میں آغاز، ترقی اور انتہا کی شرط دراصل ارسطوئی ہے اور ڈرامے کے لیے وضع کی گئی تھی اور بعد میں خود ڈراما میں یہ ترک ہوگئی یا اگر ترک نہیں ہوئی تو اس کی مطلقیت (Absoluteness) کو معرض سوال میں لایا گیا۔ لہٰذا اس شرط کو نظم پر عائد کرنا ارسطو اور شعریات دونوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ پانچواں اعتراض یہ ہے کہ یہ دونوں شرائط جن اصولوں کی روشنی میں وضع کیے گئے ہیں وہ اگر ہیں بھی تو سراسر مغرب مرکوز (Westocentric) ہیں، یعنی ان کو غیر مغربی شاعری سے کوئی علاقہ نہیں۔ اگر اردو فارسی شاعری غیر مہذب اور غیر ترقی یافتہ ذہن کی پیداوار ہے بھی تو چینی، جاپانی اور سنسکرت شاعری تو غیر مہذب ذہن یا غیر نفیس تہذیبوں کی پیداوار نہیں ہے۔ ہم یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ سنسکرت میں Epigrammatic شاعری کی کثرت ہے۔ اس میں کوئی مقولہ، کوئی خیال، کوئی تاثر، کوئی رائے، محض چند لفظوں میں نچوڑ کر رکھ دی جاتی ہے۔ یہ شاعری نہ مربوط خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے اور نہ کسی خیال کو آغاز، ترقی اور انتہا کے منازل سے گزارتی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ جاپانی شاعری کا بڑا حصہ محض اشاروں پر مبنی نظموں پر مشتمل ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ چینی نظموں میں اس طرح کا ربط مفقود ہوتا ہے جس کا ہم تقاضا کر رہے ہیں۔ لہٰذا ممکن ہے انیسویں صدی کی انگریزی شاعری کے چند نمونوں پر ان شرائط کا اطلاق ہو سکے، لیکن دنیا انیسویں صدی کے انگلستان سے بہت بڑی ہے۔ چھٹا اعتراض یہ ہے کہ یہ شرائط غیر منطقی ہیں، کیونکہ ''ربط خیالات'' کی اصطلاح مبہم ہے۔ اگر ہر طرح کا ربط، ربط کا حکم رکھتا ہے تو ربط کی شرط ہی مہمل ہے۔ کیونکہ لوگوں نے تو لوئیس کیرل (Lewis Carrol) کی Alice in Wonderland میں بھی طرح طرح کے ربط ڈھونڈ لیے ہیں۔ تازہ ترین ''تحقیق'' تو یہ ہے کہ یہ کتاب دراصل ملکہ وکٹوریہ کی خفیہ ڈائری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وکٹوریہ کی خفیہ ڈائری والی نام نہاد تحقیق کو ہم مطائبہ سمجھتے ہیں لیکن

Alice in Wonderland کی نفسیاتی توجیہات تو خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ دوسری طرف، تشریح اور تفہیم کو آزاد اور خود مکتفی عمل قرار دینے والے نقادوں نے ایک ہی فن پارے کی کیسی کیسی متغائر توجیہات پیش کی ہیں اس کی مثال ان دنوں مغربی تنقید میں نظر آتی ہے۔ وہاں آج کل یہ مباحثہ بہت گرم ہے کہ کیا تشریح وتفہیم کو شاعر کے عندیے کا پابند ہونا چاہیے، یا اسے آزاد ہونا چاہیے۔ اسے آزاد قرار دینے والی جماعت کے ایک سرگرم رکن رابرٹ کراس مین(Robert Crossman) نے اپنے مضمون (1980) میں ثابت کرنا چاہا ہے کہ ازرا پاؤنڈ کی مشہور نظم In a Station of the Metro دراصل اس بات کی ترغیب دیتی ہے کہ لوگوں کو دودھ مکھن خوب استعمال کرنا چاہیے۔ نظم کا کام چلاؤ ترجمہ آپ بھی سن لیجیے:

زمین دوز ریل کے ایک اسٹیشن میں
ازدحام میں ان چہروں کے موہوم آسیبی وجود
ایک سیاہ، نم شاخ پر پنکھڑیاں

اصل نظم حسب ذیل ہے:

In a Station of the Metro
The apparition of these faces in the crowd
Petals on a wet, black bough

رابرٹ کراس مین نے مختلف طرح کے ربط تلاش کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ یہ نظم دودھ مکھن کے کثیر استعمال کی ترغیب دیتی ہے۔ اس طرح کے تجزیوں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے محض ''ربط'' کی شرط نہ صرف یہ کہ ناکافی ہے، بلکہ مہمل بھی ہے۔ ضروری ہے کہ ربط کی نوعیت کو بھی واضح اور متعین کیا جائے۔ کلیم الدین صاحب اور ان کے مقلدوں نے ربط کے تصور کو عمومی اور مشینی طور پر استعمال کرکے اس کی معنویت مجروح کردی ہے۔ اسی طرح، خیال کے آغاز، ترقی اور انتہا سے کیا مراد ہے؟ ارسطو نے تو پلاٹ کے تعلق سے آغاز، وسط اور انجام کی بات کی تھی اور کہا تھا کہ آغاز وہ ہے جس کے پہلے کچھ واقع نہ ہوا ہو، وسط وہ ہے جس کے پہلے بھی کچھ ہوا ہو اور بعد میں بھی کچھ ہو، اور انجام وہ ہے جس کے بعد کچھ واقع نہ ہو۔ کیا آغاز، وسط اور انجام کی یہ تعریفیں نظم کے حوالے سے آغاز، ترقی اور انتہا پر منطبق ہو سکتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ نظم کا آغاز اور اختتام تو ہو سکتا ہے اور اس اختتام کے طریقوں سے تفصیلی بحثیں بھی ہوئی ہیں۔ لیکن نظم کی انتہا کہاں ہے اور انتہا کے بعد زوال کیوں نہیں ہے۔ ان سوالوں کے جواب کلیم الدین اسکول کے پاس نہیں ہیں۔

اوپر میں نے پہلا اعتراض یہ بیان کیا تھا کہ ربط وتسلسل اور آغاز و ارتقاے خیال کی یہ شرطیں مغربی شعریات میں وضاحت سے کبھی بیان نہیں ہوئیں۔ اب میں مزید یہ کہتا ہوں کہ ان سے مختلف شرطیں ضرور بیان ہوئیں ہیں۔ ملارمے اور والیری کے خیالات سے ہم سب واقف ہیں کہ چیزوں کو بیان کرنے کے بجائے ان کی طرف بس اشارہ کردینا کافی، بلکہ بہتر ہے۔ ایڈورڈ فنولسا(Edward Fenollosa) کے چینی تراجم کے ذریعے مغربی ادب کو بیسویں صدی کے اوائل ہی میں معلوم ہو چکا تھا کہ نظم میں محض تاثر اور مبہم لیکن روایاتی معنی کے فریم پر مبنی اشارے بھی ہو سکتے ہیں۔ پاؤنڈ نے اس خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ روایاتی معنی کے فریم کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اوپر درج کردہ اس کی نظم چینی طرز میں ہے۔ لیکن اس میں روایاتی معنی کا کوئی شائبہ نہیں۔ لہٰذا ایک طرف تو ملارمے اور والیری جیسے علامت نگار تھے جو نظم میں خیال کی وضاحت اور ربط کے بجائے اس کے ابہام اور بے ربطی پر زور دے رہے تھے اور دوسری طرف پاؤنڈ اور ہیوم جیسے نظریہ والے تھے جو وضاحت اور ربط کی جگہ تاثر کی درستی (Accuracy of impression) کا تقاضا کر رہے تھے۔ لیکن یہ سلسلہ صرف انیسویں صدی سے نہیں شروع ہوتا۔ یہ خیال بہت شروع سے عام تھا کہ نظم میں خیال بیان کیا جائے تو بہت خوب، یا چند خیالات کو مرتب کرکے پیش کیا جائے، یہ بھی بہت خوب، لیکن یہ بالکل ضروری نہیں کہ نظم کے مختلف حصوں، یا اس کے مختلف خیالات میں لامحالہ طور پر ایک سطری ربط یعنی (Linear relationship) ہو۔ باربرا اسمتھ کی کتاب The Poetic Closure کا مطالعہ ہی اس بات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ نظم اختتام تک پہنچنے کے لیے کن کن مراحل سے گزر سکتی ہے۔ بہرحال آپ 1580 میں سرفلپ سڈنی کو سنیے:

''صرف شاعر ہی ایک ایسی ہستی ہے جو [حکیموں، فلسفیوں وغیرہ کی] بندشوں اور مجبوریوں سے آزاد ہے بلکہ ان کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے اور اپنی ہی قوت ایجاد کے بل بوتے پر ان مجبوریوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے اور سچ پوچھیے تو ایک نئی فطرت (Another nature) کو اگاتا ہے اور پھر، وہ یا تو اشیا کو ان کی اس حالت سے بہتر بناتا ہے جو ان میں فطرتاً خلق ہوئی تھی، یا پھر بالکل نئی چیزیں بناتا ہے، ایسی صورتیں جو فطرت میں پہلے کبھی تھیں ہی نہیں۔۔۔''

ظاہر ہے کہ جب شاعر فطری چیزوں کو دوبارہ اپنے طور پر بناتا ہے، یا نئی چیز بناتا ہے تو اس کی تخلیق میں اس قسم کا اقلیدسی نظم ہونا لازم نہیں جو فطرت میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ یونانی حکما بہت سی چیزوں کو محض اس لیے اچھی قرار دیتے تھے کہ وہ ان کے خیال میں فطری نظم کی آئینہ دار تھیں۔ خود ارسطو نے المیہ کے مختلف حصوں اور خطابت کے اسلوب کو جس طرح متعین کیا تھا، وہ اس کے خیال میں اس لیے بہترین تھا کہ وہ فطرت کے مطابق تھا لیکن ارسطوئی نظم وضبط کے اصول بہت دن قائم نہ رہ سکے، کیونکہ خود ارسطو کے نظام میں ان کی مخالف قوتیں موجود تھیں۔

بہرحال یہ الگ بحث ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ نظم میں جس قسم کی اقلیدسی ربط ونظم کا تقاضا کلیم الدین اسکول کے اراکین کی طرف سے اس لیے

ہوتا ہے کہ یہ مغربی شعریات کا اہم اصول ہے، وہ ربط ونظم مغرب کی شعریات میں کوئی مرکزی حیثیت نہیں رکھتا۔ مغربی شعریات اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ یک سطری ربط کے علاوہ اور طرح کے ربط بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً تکرار بھی مربوط کرتی ہے اور یہ بات بھی مغربی مفکرین سے پوشیدہ نہیں کہ ہر طرح کی نظم میں اقلیدسی ربط نہیں ہوسکتا اور نظم کا اختتام تو ہوتا ہے، لیکن کوئی ضروری نہیں کہ اس میں ارتقا اور انتہا بھی ہو۔

اوپر میں نے عرض کیا ہے کہ نظم میں اقلیدسی ربط وتسلسل کی شرط رکھنے والے مفکرین کا کہنا ہے کہ ربط اور تسلسل ترقی یافتہ ذہن کی پہچان ہیں۔ دراصل ان مفکرین کا یہ خیال ان کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ منطقی فکر یعنی دو چیزوں میں ربط دیکھ لینے کی صلاحیت اور اس سے نتیجہ نکالنے کی صلاحیت انسانی دماغ کی بہت بڑی قوت ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ قوت دماغ کے اس حصے میں ہوتی ہے جو ارتقا کے دور دوم میں وجود میں آیا۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دماغ کا یہ حصہ پہلے حصے سے زیادہ ترقی یافتہ بھی ہے۔ بچے کے دانت بعد میں نکلتے ہیں اور آنکھ پہلے سے رہتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دانت، آنکھ سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتے ہیں۔ انسان کے بہت سے عظیم ترین کارنامے اسی اولین دماغ کے باعث وجود میں آئے ہیں جسے ''دماغ خزندہ'' (Reptilian brain) کہا جاتا ہے۔ علاوہ بریں زبان، جو انسان کا عظیم ترین تخلیقی کارنامہ ہے، ربط اور تسلسل سے کم وبیش عاری ہے۔ نوم چامسکی (Noam Chomsky) کی وضع عمیق (Deep Structure) اور اس کی استحالاتی قواعد (Transformational Grammar) بھی اس بات کو واضح نہیں کر پائی ہے کہ ایسے بہت سے فقرے اور الفاظ کے مرکبات بچوں کی زبان پر کہاں سے آجاتے ہیں جب انھوں نے پہلے انھیں کبھی نہیں سنا ہوتا، اور نہ ان کے ماحول میں ایسی گنجائش ہوتی ہے کہ وہ ایسے مرکبات اور فقرے وضع کرسکیں۔

واضح رہے کہ استحالاتی قواعد، مرکبات اور فقروں کے وضع کرنے کے اصول بتانے سے قاصر ہے۔ کلیم الدین صاحب کے نظریۂ ربط وتسلسل پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کئی سال پہلے لکھا تھا کہ قواعد اور صرف ونحو کے تقریباً تمام اصول منطق کے ماورا یا منطق سے بے گانہ ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ دنیا کی بعض اعلیٰ ترین زبانوں، مثلاً عربی میں ربط وتسلسل کا اظہار کرنے والی بنیادی اکائی، یعنی زمانہ (Tense) بہت ناقص درجے کی ہے۔ خود ہماری زبان کا یہ عالم ہے کہ ہم اکثر ماضی بول کر مستقبل اور مضارع بول کر ماضی مراد لیتے ہیں۔ قواعد اور صرف ونحو کا انتشار اور مختلف زبانوں میں ان کا فرق اتنا وسیع ہے کہ یہ بات بھی مشکوک ہو جاتی ہے کہ شاید کبھی کوئی آفاقی زبان رہی ہو، اور آج کی زبانیں اس قدیم آفاقی زبان کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ لہٰذا جب انسان کے بہترین کارنامے میں عدم تسلسل اور انتشار کا یہ عالم ہے تو ہم کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ ربط وتسلسل لازمی طور پر ترقی یافتہ ذہن کی پہچان ہیں؟

زبان میں اس عدم تسلسل اور منطقی بے ربطی کا اثر ادب پر لازمی ہے۔ چنانچہ ایلیٹ کا مشہور قول ہے کہ جس طرح حقائق کی ایک منطق ہوتی ہے، اسی طرح جذبات کی بھی ایک منطق ہوتی ہے اور شاعری جذبات کی منطق کو استعمال کرتی ہے۔ کولرج اس نکتے کو بہت پہلے سمجھ چکا تھا، لہٰذا اس نے کہا کہ شاعری کی ضد نثر نہیں بلکہ سائنس ہے۔

یہاں اس بات کو ملحوظ رکھیے کہ نظم کی وحدت (Unity) اور شے ہے اور اس میں ربط وتسلسل شئے دیگر ہے۔ یک سطری ربط (Liner relationship) کے بغیر بھی وحدت پیدا ہوسکتی ہے، جیسا کہ ایلیٹ نے خود کہا ہے:

''مشمول یا مافیہ (Material) کی ایک حد تک مختلف النوعیت شاعر کے ذہن کی کارکردگی کے ذریعہ وحدت جبری میں تبدیل ہوسکتی ہے۔ یہ ذہنی کارکردگی شاعری میں ہمہ وقت موجود رہتی ہے۔''

ایک حد تک مختلف النوع مشمول کو شاعر کا ذہن وحدت میں تبدیل کردیتا ہے۔ اس کی اچھی مثال قصیدے میں ملتی ہے۔ تشبیب میں اکثر شعر بے ربط ہوتے ہیں، لیکن شاعر ان کو تشبیب کی ہیئت میں اس طرح باندھتا ہے کہ وحدت پیدا ہوجاتی ہے۔ مومن کے مشہور قصیدے کی تشبیب کے پہلے چند شعر ہیں

یاد ایام عشرت فانی
نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
عیش دنیا سے ہوگیا دل سرد
دیکھ کر رنگ عالم فانی
جائیں وحشت میں سوے صحرا کیوں
کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
خاک میں اشک آسماں سے ملے
ہائے کیسی بلند ایوانی

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں کوئی ربط نہیں، لیکن وحدت ہے۔ اقبال کی نظم ''مسعود مرحوم'' بھی اس وحدت کی اچھی مثال ہے۔ اس کے پہلے بند میں راس مسعود کا ذکر اور ان کی موت پر ماتم ہے، لیکن دوسرے میں انسانی زندگی کی بے ثباتی اور اسرار کا ذکر ہے اور تیسرے میں خودی کی تعریف وتلقین ہے۔ تینوں میں کوئی ربط نہیں، لیکن شاعر کا ذہن تینوں بندوں میں ایک ہی طرح کام

کر رہا ہے، اس لیے پوری نظم میں وحدت ہے۔

نظم کی وحدت اور جذباتی منطق کی کارآفرینی کا تعلق اس بات سے بھی ہے کہ تمام منظوم کلام واقعی ''کلام'' یعنی Utterance ہوتا ہے اور کلام کا تعلق، بلکہ اس کی بنیاد'' زبانی پن'' یعنی Orality پر ہے۔ مغرب کو یہ بات معلوم کرنے میں کئی سو برس لگے کہ شاعری گفتگو یعنی Discourse نہیں، بلکہ کلام یعنی Utterance ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں (یعنی عربی فارسی اردو میں) شاعری کے لیے'' کلام'' کا لفظ عرصۂ دراز سے مستعمل ہے۔ کلام کی داخلی منطق، تحریر کی داخلی منطق سے الگ ہوتی ہے، اس بات کا احساس ہم لوگوں کو بہت کم ہے، لیکن مغرب سے زیادہ ہے۔ جیسا کہ والٹر آنگ (Walter Ong) نے اپنی کتاب'' زبانی پن اور خواندگی'' (Orality and Literacy) میں دکھایا ہے۔ خواندہ تہذیبوں کو زبانی تہذیبوں کی نوعیت کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ناخواندہ تہذیبوں کو زبانی تہذیبوں کی نوعیت کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ناخواندہ لوگ بھی، اگر وہ خواندہ تہذیبوں میں رہتے ہیں، زبانی تہذیب کا پورا احساس نہیں کر سکتے۔ ایسی تہذیب کو، جس میں خواندگی بالکل نہ ہو، والٹر آنگ'' اولین زبانی پن'' (Primary Orality) سے مختص قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

'' خالص زبانی روایت، یا اولین زبانی پن کا درستگی اور معنویت کے ساتھ تصور کرنا آسان نہیں۔ تحریر کی بنا پر'' الفاظ'' اشیا سے مشابہ لگنے لگتے ہیں، کیونکہ ہم الفاظ کا تصور دکھائی دینے والے نشانات کی حیثیت سے کرتے ہیں، جن کے ذریعے وہ الفاظ (اشیا کے) کوڈ (Code) کو ظاہر کرتے ہیں۔ ہم متون میں اور کتابوں میں لکھے ہوئے ایسے'' الفاظ'' کو چھو، اور دیکھ سکتے ہیں۔''

تحریری لفظ پر اس مکمل انحصار کے باعث الفاظ کی آوازیں، ان کے اتار چڑھاؤ، ان کے رنگ روپ، ہم سے نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ بولا ہوا لفظ لکھے ہوئے لفظ سے زیادہ موثر ہوتا ہے اور اس کا اثر لکھے ہوئے لفظ کے مقابلے میں مختلف طرح سے عمل میں آتا ہے، لیکن ہم روزمرہ کی زندگی میں اس اصول کی کارفرمائی دیکھ سکتے ہیں۔ کسی لڑکی کو پرچے پر لکھ کر بھیجنا کہ'' مجھے تم سے محبت ہے'' یہی بات اس سے زبانی کہنے کے مقابلے میں زیادہ مشکل اور مختلف معلوم ہوتی ہے۔ کلام میں'' ربط'' کے وہ معنی نہیں ہوتے جو تحریر میں ربط کے ہوتے ہیں۔ کسی بھی پڑھے لکھے شخص کی آزاد گفتگو (Free Speech) کی ٹیپ اور اس کی تحریر کے ایک صفحے کا مقابلہ اس بات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

ہماری شاعری چونکہ ایسے سماج میں پیدا ہوئی جو اولین زبانی پن (Primary orality) کی صفت سے متصف تو نہ تھا، لیکن بڑی حد تک ناخواندہ اور زبانی تھا۔ اس لیے ہماری شاعری میں کلام کا عنصر ہر حیثیت سے زیادہ رہا ہے۔ مشاعرے اس بات کا زندہ ثبوت ہیں۔ قصیدے اور مرثیے لکھے ہی اس لیے جاتے تھے کہ محفلوں میں سنائے جائیں۔ مثنوی کو بھی پڑھ کر یا زبانی سنانے کا رواج تھا۔ کہنے کو تو مرثیے، مثنوی اور قصیدے غزل کے مقابلے میں مربوط ہوتے ہیں، لیکن ذرا سا بھی تجزیہ اس بات کو واضح کر دے گا کہ ہر قصیدے یا ہر مرثیے یا مثنوی میں ربط کا عنصر برابر نہیں ہوتا۔ اردو میں نظم کی تعریف متعین کرتے وقت ہمارے سماج کی نیم خواندگی اور اس کے بڑی حد تک زبانی (Oral) ہونے کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ داستانوں کا مطالعہ ہمیں ایک حد تک خالص زبانی کلام کی صفات کا اندازہ دے سکتا ہے۔

لہٰذا نظم میں عام طور سے ایک طرح کا ربط اور تسلسل ضرور ہوتا ہے۔ لیکن نظم چونکہ کلام ہے، اس لیے یہ ربط اور تسلسل ہر نظم کے ساتھ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور اس کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ ہر نظم میں ایک ہی طرح کا ربط و تسلسل نہیں ہوتا اور مختلف اقسام نظم میں بھی اس صفت کی کیفیت اور کمیت مختلف ہوتی ہے۔ قصیدے کا تسلسل اور طرح کا ہے، مثنوی کا اور طرح کا، نئی نظم کا اور طرح کا۔ اور ربط و تسلسل کا وہ اقلیدسی تصور جو مغربی شعریات کے غلط مطالعے پر مبنی غلط نتائج نکال کر بعض لوگوں نے عام کرنا چاہا، وہ بہرحال ناقص اور ناکافی ہے۔ اسی طرح ہمیں یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ صاحب، غزل میں بھی ایک طرح کا داخلی تسلسل، ایک مابعد الطبیعیاتی ربط، ایک مزاج، ایک ہم آہنگی ہوتی ہے۔ غزل میں ربط نہیں ہوتا۔ نظم میں ربط ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا، لیکن وحدت ضرور ہوتی ہے۔ غزل میں وحدت بھی نہیں ہوتی اور یہ غزل کی سب سے بڑی مضبوطی ہے۔ غزل کی ہیئت تمام دنیا کی اصناف میں بے مثال اور وحید (Unique) ہے۔ ہمیں غزل کی نام نہاد'' ریزہ خیالی'' پر شرمندہ نہ ہونا چاہیے، بلکہ ہمیں اس مہمل لفظ کو تنقید کے دائرے سے باہر نکال دینا چاہیے۔ ریزہ خیالی کیا'' لالۂ صحرا'' میں نہیں ہے؟ ریزہ خیالی کیا'' زمانہ'' میں نہیں ہے؟ ریزہ خیالی کیا'' محراب گل افغان کے افکار'' کے بعض حصوں میں نہیں ہے؟ ان منظومات میں وحدت ہے، اس لیے یہ نظم ہیں۔'' اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا'' میں وحدت نہیں ہے۔ اس کے دو شعر ('' اے صبح ازل'' اور'' محمد بھی ترا'') باقی تین سے بالکل الگ ہیں۔ غزل کو اس کی بحر، قافیہ اور ردیف جتنی وحدت بہم پہنچا دیتے ہیں، وہ اس کے لیے کافی ہے۔ اتنی وحدت نظم کے لیے کافی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ منظومہ جو غزل نہیں ہے، نظم ہے اور نظم کی بنیادی صفت وحدت ہے، جس کا ایک تفاعل ربط و تسلسل ہے۔ یہ ربط و تسلسل کئی طرح کا ہوتا ہے اور ہر نظم کے ساتھ اور ہر قسم نظم کے ساتھ بدلتا بھی رہتا ہے۔

گیان چند جین

ہماری مطبوعات

"اردو کی نثری داستانیں" سے اقتباس

داستان گوئی

قصہ سننا اور سنانا انسان کا محبوب مشغلہ ہے۔ اسلامی ممالک اور ہندوستان میں یہ باقاعدہ فن ہوگیا ہے جسے اہل کمال نے پیشے کے طور پر اختیار کیا۔ عربی میں قصے کو سمر اور قصہ خواں کو سامر کہتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں اس کا رواج بڑے دلفریب طریقے پر تھا۔ شام کے کھانے کے بعد چاندنی راتوں میں سب ریت پر بیٹھ جاتے تھے اور سامر داستان سناتا تھا۔ اجرت میں اسے کھجوروں کا ایک حصہ دیا جاتا تھا۔ بعد میں قہوہ خانوں اور بازاروں میں داستان گوئی کے اڈّے بن گئے۔ عرب کی داستان گوئی کا شاہکار الف لیلہ ہے۔ تاریخ حلب[1] سے ایک قصہ خواں کا رنگ ڈھنگ ملاحظہ ہو۔

قصہ خواں قہوہ خانے میں چل پھر کر قصہ سناتا ہے۔ شروع میں وہ جملہ پڑھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا ڈنڈا، ڈگڈگی اور بانسری ہوتی ہے۔ بیچ بیچ میں وہ انھیں بجاتا ہے۔ اس کی آواز اور حرکات بہت ظریفانہ ہوتی ہیں۔ کہانی کو وہ منتہا پر پہنچا کر خاموشی سے اگلے دن کے لیے نکل جاتا ہے۔ آخر میں وہ پیسے مانگتا ہے۔ طنجہ (Tangir) میں ایک قہوہ خانے میں قتل ہونے پر وہاں قصہ خوانی بند کردی گئی جس کے بعد بازار میں داستانیں سنائی جانے لگیں۔

ایران میں اس فن کو اور ترقی ہوئی۔ قصۂ حاجی بابا اصفہانی میں ایک قصہ خواں کا ذکر ہے۔ ایران میں بعض قابل ادیبوں اور شاعروں نے بھی اس فن کو اختیار کیا۔ ایرانی قصہ خوانوں نے مجملہ اور قصوں کے شاہنامے سے بھی اپنے مواد کو لیا۔ محمد حسین آزاد ایران کے عام قصہ خوانوں کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

"ایران کے بازاروں میں اور اکثر قہوہ خانوں میں ایک شخص نظر آئے گا کہ سروقد کھڑا داستان کہہ رہا ہے اور لوگوں کا انبوہ اپنے ذوق و شوق میں مست اسے گھیرے ہوئے ہے۔ وہ ہر مطلب کو نہایت فصاحت کے ساتھ نظم و نثر سے مرصع کرتا ہے اور صورتِ ماجرا کو اس تاثیر سے ادا کرتا ہے کہ سماں باندھ دیتا ہے، کبھی ہتھیار بھی لگائے ہوتا ہے۔ جنگ کے معرکے یا غصے کے موقعے پر شیر کی طرح بپھر جاتا ہے۔ خوشی کی جگہ اس طرح گاتا ہے کہ سننے والے وجد کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ غیظ و غضب، عیش و طرب، غم والم کی تصویر اپنے کلام ہی سے نہیں کھینچتا بلکہ خود اس کی تصویر بن جاتا ہے، اسے درحقیقت بڑا صاحب کمال سمجھنا چاہیے کیونکہ اکیلا آدمی ان مختلف کاموں کو پورا پورا ادا کرتا ہے جو کہ تھیٹر میں ایک سنگت کر سکتی ہے۔ ایسے مقلوں کو قصہ خواں کہتے ہیں[2]۔"

ایک ایرانی قصہ خواں[3] ملا میرزا اسد بیگ شیرازی نے جہانگیر کی ملازمت کرلی۔ توزک میں جہانگیر نے لکھا ہے کہ چونکہ وہ پُرنقل اور شیریں حکایت اور خوش بیاں تھا اس لیے اس نے اسے انعام و اکرام و خطابات سے سرفراز کیا اور حکم دیا کہ ہمیشہ مجلس گپ میں حاضر ہوا کرے۔

اکبر ثانی کے دربار میں قصہ گو ملازم ہوا کرتے تھے۔ میر باقر علی داستان گو کے نانا امیر علی قلعے میں قصے سناتے تھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ بہادر شاہ ظفر کے عہد میں بھی قصہ خوانوں کی سرپرستی کی گئی۔ باقر علی کے ماموں میر کاظم علی نے اس فن میں اتنی ترقی کی کہ لکھنؤ اور حیدرآباد کے داستان گویوں سے بڑھ گئے۔ انھوں نے قصہ خوانی چھوڑ کر داستان گوئی اختیار کی۔ لکھنؤ میں ہر دولت مند[4] کی سرکار میں داستاں گو کو ملازم ہونا لازمۂ امارت تھا۔ افیونیوں نے اس فن کی یہاں تک قدر کی کہ داستان سننے کو اپنی صحبتوں کا ایک عنصر اعظم قرار دیا۔ جلال لکھنوی کے والد حکیم اصغر علی[5] داستاں گو واجد علی شاہ کی سرکار سے وابستہ ہونے کی وجہ سے خود کو داستاں گوئے سلطانی لکھا کرتے تھے۔ دربار رام پور نے داستاں گویوں کی بڑی قدر کی جس کی وجہ سے دلّی اور لکھنؤ کے مشہور داستان گو رام پور چلے آئے۔ لکھنؤ سے حکیم اصغر علی اور میر نواب رام پور چلے گئے۔ لکھنؤ میں مرزا طور اور بڑے منشی میر فدا علی مشہور داستان گو تھے۔

داستاں گویوں کا کمال محض دربار و ایوان ہی کے لیے نہ تھا وہ عوام سے بھی اپنی شیوہ بیانی کی داد لیتے ہیں۔ پشاور میں بازار قصہ خوانی کا نام گیا گیا یادیں تازہ کرتا ہے۔ رجب علی بیگ سرور[6] نے لکھنؤ کے بازاروں میں قصہ خوانوں کی موجودگی کا ذکر یوں کیا ہے۔

"یک جا قصہ خواں حمزہ و عمرو کی داستان"

"کہیں قصہ خواں فصاحت سے گرم بیاں، کہیں بزم شاہ اودھ کی حکایت کہیں کابل کی رزم کی داستان، ایک طرف خسرو شیریں کی روایت۔ ذکر رستم فسانۂ سیستاں۔"

اردو میں داستان گوئی کی ابتدا دلّی میں ہوئی۔ لیکن اس کو عروج لکھنؤ میں ہوا۔ رتن ناتھ سرشار[7] اپنے سحر آفریں رنگ میں سماں باندھتے ہیں۔

● اردو میں جو نثری داستانیں قلم بند کی گئی ہیں ان کی تعداد سیکڑوں سے تجاوز کرجاتی ہے۔ پروفیسر گیان چند جین کی یہ کتاب تمام دستیاب نثری داستانوں کا تعارف بھی ہے اور ان پر تنقیدی محاکمہ بھی۔ مختلف داستانوں کے فنی مدارج اور اس فن کے عہد بہ عہد ارتقا پر بھی عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔906 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 276 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

"لکھنؤ سے بڑھ کر داستان گوئی کا چرچا اور کہیں کم ہوگا۔ بیس پچیس یارانِ صادق اور دوستانِ موافق شب کے وقت کے پردہ دارِ عاشقاں ہے۔ ایک مقام پر جمع ہوئے۔ کوئی گنا چھیل رہا ہے، کوئی پونڈے پر چاقو تیز کر رہا ہے۔ جابجا پیالیوں میں افیون گھل رہی ہے۔ حقیقت تو یوں ہے کہ افیون کا گھولنا اور گنے کا چھیلنا بھی لکھنؤ والوں ہی کا حصہ ہے۔ کہیں چائے تیار ہو رہی ہے اور داستاں گو صاحب لحنِ داؤدی فرما رہے ہیں۔ ایک ایک فقرے پر سبحان اللہ اور واہ واہ کی تعریف ہوتی جاتی ہے اور داستان گو صاحب کا دماغ عرشِ بریں سے گزر کر لامکاں کی خبر لاتا ہے۔"

شاہد احمد دہلوی بھی ایک مضمون[8] میں ایسا ہی سماں پیش کرتے ہیں۔

بادشاہوں اور نوابوں کا ذکر ہی کیا، عوام کا یہ حال تھا کہ دس بیس یار دوست رات کو کسی جگہ جمع ہوگئے۔ کوئی گنا چھیل رہا ہے، کوئی شیرینی کا دونا لیے بیٹھا ہے اور داستان گو رطب لسانی میں مصروف ہے۔

سننے والے افیون کی چسکی لگائے جاتے ہیں اور واہ واہ سبحان اللہ کہے جاتے ہیں۔ داستان گو بڑا مزاج شناس ہے اور ہوا کا رخ دیکھ کر بات کرتا ہے۔ کوئی بات اپنی داستان میں ایسی نہیں آنے دیتا جس سے اس کے سننے والوں کی دلچسپی میں کمی آئے۔"

داستان گوئی سنانے کا فن ہے۔ لکھنے کا نہیں آج کل جو کہلاتا ہے۔

داستان گو اسی کا اداکار ہوتا تھا۔ اس کے پاس ذخیرۂ علم اور طلاقتِ لسانی کے دو اوصاف مزید ہوتے تھے۔ اس فن کے آخری باکمال میر باقر علی داستاں گو کی داستان خوانی کی کیفیت مختلف اہلِ قلم نے بیان کی ہے۔ ان کے بیانات سے ایک مثالی داستان گو کا نقشہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"امیر حمزہ[9] کی کسی داستان کا کوئی مختصر واقعہ تین گھنٹے سے کم میں نہیں سناتے تھے۔ رزم کا نقشہ کھینچتے تو معلوم ہوتا کہ داستان کا میدان، میدانِ جنگ بن گیا ہے، بڑے زور کا رن پڑ رہا ہے اور میر صاحب خود تلوار، کھانڈا، قردلی، کٹاری، خنجر، دشنہ اور سیکڑوں ہتھیار چلا رہے ہیں۔ بیان میں ایک زور آجاتا اور میر صاحب پہلو اور پینترے بدل بدل کر اصل کی نقل اتارتے اور بزم کو رزم کا نقشہ دکھا دیتے۔ ہتھیاروں کے نام گنانے شروع کرتے تو سیکڑوں نام لے جاتے، یہی حال زیوروں اور جواہرات بلکہ ہر بات کا تھا۔ غرض معلومات کی ایک انسائیکلوپیڈیا تھے۔ عیاروں کا بیان کرتے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ میر صاحب عیار کی تصویر بن جاتے اور پرلطف واقعات بیان کرنے میں ایسا لہجہ اختیار کرتے کہ سامعین مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بن جاتے۔ داستان شروع کرنے سے پہلے چاندی کی ایک کٹوری میں افیون کی ایک گولی روئی میں لپیٹ کر گھولتے تھے اور بڑی نفاست سے اپنا نشہ پانی کرتے تھے۔"

"غرض جو مرقع کھینچا بے مثل۔ جو نقشہ پیش کیا بے نظیر۔ جنگ کا ذکر چھیڑا تو فنونِ سپہ گری کا کون سا گوشہ تھا، حفظِ مراتب، وزرا اور امرا کی آمد، شاہی دبدبہ، درباری آداب، چوب داروں کی پکار، لفظوں سے ایسا سماں باندھا کہ تمام کیفیت آنکھوں کے سامنے پھر گئی پھر جو شاہی مطبخ کی طرف رخ کیا تو ستر قسم کے پلاؤ گن ڈالے۔ دستر خوان کا سلیقہ، بسم اللہ خوان کی آواز، غرض کہ جو تصویر کھینچی جزئیات سے پُر اور فن کاری کا بہترین نمونہ تھی۔"

"ان کی طرز ادا[10] ایسی دلچسپ ہوتی تھی کہ کیا کہیے۔ اصوات و حرکات کے پورے اداکار تھے۔ میدانِ جنگ کا نقشہ کھینچتے تو یہ معلوم ہوتا کہ رستم و اسفند یار کی کشتی دیکھ کر ابھی آئے ہیں۔ بزمِ عیش کا سماں باندھتے تو فضا میں مستانہ رنگ نظر آنے لگتا۔ ہر جذبے کی تصویر کھینچا کیا معنی، خود تصویر بن جاتے تھے۔ حافظہ اس بلا کا تھا کہ دفتر کے دفتر نوکِ زبان تھے۔ کھانوں کا ذکر آیا تو الوانِ نعمت کی فہرست کھول دی، کشتی کا بیان کیا تو گوندی شاہ والوں اور شیخو والوں کے سارے داؤ پیچ گنوا دیے۔"

افسوس! ایسا فن اور ایسے فن کار صفحۂ ہستی سے بالکل جاتے رہے۔

دربارِ رامپور میں نواب محمد سعید خاں کے وقت (1840) کے قریب سے دوسری جنگ عظیم تک داستان گو ملازم ہوتے تھے۔ یہ نہ صرف داستانیں سناتے تھے بلکہ داستانیں تصنیف کر کے سپردِ قلم بھی کرتے تھے۔ نواب کلب علی خاں کو داستانوں کا یہاں تک شوق تھا کہ خود انھوں نے تین داستانیں لکھیں۔ شاہ پسند فن عوام پسند ہو جاتا ہے۔ رام پور کے داستاں گویوں نے امیر حمزہ اور بوستانِ خیال کے سلسلے میں دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے۔ ان کے واحد قلمی نسخے اسٹیٹ لائبریری رام پور میں موجود ہیں۔ یہ سو سے زیادہ ہیں اور ان کی ضخامت اس قدر ہے کہ ایک نسخے کو پڑھنے کے لیے مہینوں کی مدت چاہیے۔ یقیناً بعض مخطوطات ضائع بھی ہوگئے ہوں گے۔ ان کی ضخامت اور ان کی فراوانی ان کی طباعت کے راستے میں مانع ہے۔ بدنصیب تھے یہ داستاں نویس کہ ان کے فکر پارے اشاعت کا منہ نہیں دیکھ سکے، ورنہ بہت ممکن ہے کہ ان میں زبان و بیان کے وہ جواہر موجود ہوں جو اردو ادب کے دامن کو مالا مال کر دیں۔

انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں جب علی گڑھ اور دلی میں نئے ادب کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ رام پور اور لکھنؤ نوابی اور جاگیرداری نظام کے رنگین کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔ پنجاب میں جب نئی شاعری کا مناظرہ ہو رہا تھا رام پور اور لکھنؤ امیر اور داغ کی غزلوں پر سردھن رہے تھے۔ علی گڑھ میں جب تہذیب الاخلاق کے علمی و فکری مضامین نے شمع دانش روشن کر رکھی تھی رام پور اور لکھنؤ ملکہ بہار و افراسیاب کے سحر میں گرفتار تھے۔ ان مقامات کی داستانوں نے محیر العقول عناصر کی جن رفعتوں کو چھو لیا تھا، فورٹ ولیم اس سے قطعی معذور تھا۔ اول الذکر مقامات پر داستانوں کے جتنے ضخیم دفتر سیاہ کیے گئے کالج میں اس کا شمہ بھی نہ ہوا تھا۔

منشی نول کشور نے داستانوں کی مقبولیت میں نہ صرف مالی منفعت کی گنجائش دیکھی بلکہ انھوں نے ادبی پہلو کو بھی نظر انداز نہ کیا۔ نول کشور پریس محض ایک تجارتی مطبع یا اشاعت گھر نہ تھا۔ یہ ایک تصنیفی ادارہ بھی تھا۔ یہاں کلاسیکی کتابوں یا دوسروں کے پیش کردہ مسودات کی اشاعت پر اکتفا نہ کی جاتی

تھی بلکہ منشیوں کو ملازم رکھ کر ان سے تالیف و تصنیف کا کام کرایا جاتا تھا۔ منشی نول کشور خود اردو فارسی ادب میں دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ خود انھوں نے فارسی عیار دانش کا ایک خلاصہ نگاردانش کے نام سے ترتیب دے کر شائع کیا۔ داستانوں کے فروغ میں اس ادارے کے ممتاز کارنامے امیر حمزہ، بوستان خیال اور الف لیلہ سے متعلق ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو میں ان تینوں داستانوں کی مقبولیت کا سہرا نول کشور پریس ہی کے سر ہے۔ اس مطبع نے ناول کے اٹھان کے دور میں داستان نویسی کا احیا اس زور وشور سے کیا کہ دور ثانی دور اوّل سے بھی زیادہ ہنگامہ گرم کن ثابت ہوا۔ اس شعلے میں غضب کی درخشانی تھی لیکن یہ دولتِ مستعجل ثابت ہوا۔

منشی نول کشور کی قدردانی دیکھ کر متعدد اہل قلم نے اپنی تصنیف شدہ داستانوں کے ضخیم مخطوطات ان کی خدمت میں پیش کیے لیکن بیسویں صدی کی ابتدا میں مذاق بدل جانے کی وجہ سے ان ادب پاروں کو جامۂ اشاعت نصیب نہ ہوسکا۔ نول کشور پریس کے محافظ خانے میں غیر مطبوعہ داستانوں کا ذخیرہ رام پور سے کچھ ہی کم ہوگا۔

ادب کی تشکیل میں سیاسی اور تہذیبی پس منظر کی کارفرمائی یقیناً ہوتی ہے لیکن مخصوص اصناف ادب کو مخصوص سیاسی واقعات یا سماجی کیفیات سے منسوب کرنا بڑا غیر محتاط امر ہے لیکن اس پہلو پر غور کیے بغیر مفر بھی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مافوق الفطری اردو داستان جاگیرداری کے انحطاط کی پیداوار تھی۔ اردو کی اکثر داستانیں فارسی سے لی گئیں۔ ان کی فارسی اصل غالباً اٹھارھویں صدی عیسوی سے قدیم تر نہیں۔ بوستانِ خیال محمد شاہ کے عہد میں لکھا گیا۔ چار درویش اس سے کچھ پہلے کی تصنیف ہوسکتی ہے۔ وطن عزیز کی جو شکست و ریخت انیسویں صدی میں ہوئی اس کے تاریک سائے اٹھارھویں صدی میں پڑنے لگے تھے، 1757 کی جنگ پلاسی میں ہندوستان شطرنج کی بازی ہار چکا تھا۔ اس کے بعد سے غدر تک ایک ہزیمت کی داستان ہے۔ آئے دن والیانِ ملک کے ہاتھ باندھے جارہے تھے، اربابِ اقتدار کا اقتدار سلب کیا جارہا تھا۔

سیاسی زوال نے حوصلے پست کردیے، قومی کردار گرگیا، حکومت کے فرائض انگریزوں نے اپنے ذمّے لے لیے تھے۔ اس لیے ہندوستانی تاجروں اور امرائے سلطنت کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے رکھنے کے سوا اور کوئی ذمّے داری باقی نہ رہی تھی۔ انگریزی میں خالی ذہن کو شیطان کی کارگاہ کہا جاتا ہے۔ تساہل پسند، اہلِ زر عیش پرستی کی طرف راغب ہوئے۔ راجہ کے ساتھ پرجا بھی رنگی گئی۔ ایک دفعہ ہی معاشرت کے لنون میں نیا شکوہ نیا رنگ آیا، خاموش ہونے سے پہلے چراغ بھڑکا۔ طبقۂ بالا کی عارضی اور سطحی خوش حالی نے تہذیب میں نیا رنگ بھرا۔ لکھنؤ کی سلطنت نئی تھی۔ زیادہ شاداب تھی۔ وہاں عیش پرستی کی نئی وضعیں چلیں۔ نصیرالدین حیدر اور واجد علی شاہ جیسے عیش پرست حاکموں نے محمد شاہ رنگیلے کی یاد تازہ کردی۔ لیکن ان کے یہاں جو شکوہ جو تہذیبی چمک دمک تھی وہ رنگیلے کو کہاں نصیب تھی۔

شمالی ہند میں اٹھارھویں صدی میں اردو شاعری تو جڑ پکڑ چکی تھی لیکن نثر کا کوئی مقام نہ تھا۔ اردو ادبی حیثیت کی مدعی ضرور ہوگئی تھی لیکن ابھی یہ فارسی کی زبردست حریف نہ تھی۔ اس صدی میں اردو کا نثری ادب کیا ہے: پانچ داستانیں اور دو تین مذہبی کتابیں۔ محض داستانیں ادب کو نظر میں رکھ کر لکھی گئیں۔ اردو کے ابتدائی شاعر فارسی کے شاعر بھی تھے۔ انھیں اردو میں اتنی صلاحیت نظر آئی کہ اس میں شعر کہنا انھوں نے شایانِ شان سمجھا ورنہ اس وقت تک علمیت اور قابلیت کی نمود کے لیے فارسی معیاری زبان تھی۔ شعر کے میدان میں تو اردو نے جگہ بنالی تھی لیکن نثر کے دربار میں وہ صف نعال میں ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ شاعری کی تاجداروں اور نوابوں نے سرپرستی کی۔ دلی اور لکھنؤ کے اکثر بڑے شعرا والیانِ ملک کے دامن سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ نثر کی سرپرستی کون کرتا اور کیوں کرتا؟ جو گیسوئے ادب کا سودائی ہوتا وہ نظم کے کوچے میں طواف کرتا۔ اس لیے اردو نثر کی نشوونما دیر سے ہوئی۔ نثر کا رجحان اس وقت پیدا ہوا جب دانایانِ کلکتہ نے داستانوں کا ترجمہ کرکے نثر کی طرف پیش روی کی۔ جب چند برسوں تک فن کاروں نے افسانوں میں خونِ جگر جلایا تب نثر سے حقارت کم ہوئی۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں نثری ادب داستانوں سے زیرِ بار ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ نثر لکھنے والوں کا نصب العین ادبی قابلیت کی نمود تھا۔ وہ زباں دانی کا لوہا منوانا چاہتے تھے۔ امن نے باغ و بہار میں زبان ہی کو اپنا کارنامہ کہا ہے۔ فورٹ ولیم کے ترجمے زبان ہی کی خاطر کرائے گئے تھے۔ فسانۂ عجائب، سروش سخن، طلسم حیرت وغیرہ سب اسلوب بیان کی وجہ سے وجود میں آئے۔ انشا پردازی کا موقع افسانے سے زیادہ کہاں ہوسکتا ہے؟ اس لیے اساتذۂ ادب نے داستانیں لکھیں اور انھیں مناظرِ قدرت اور صنائع انسانی کے بیانات کا ارژنگ بنادیا۔

نثر میں علمی موضوعات کے فقدان کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ان کے لیے زیادہ علم و فضل، زیادہ وسیع معلومات کی ضرورت ہے۔ طبیعت میں ایجاد و اجتہاد، غور وخوض کا مادّہ ضروری ہے۔ اس عہد میں خلاقی اور جدت عنقا تھیں۔ علوم وفنون کی ترقی اس زریں عہد میں ہوتی ہے، جب ملک میں سیاسی استحکام ہو۔ قوم میں واقعی خوش حالی اور امن کا دور دورہ ہو۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں طبقۂ بالا میں بظاہر شادابی کا خول نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر وحشت بردوش جذبات کے سوا کچھ نہ تھا۔ عوام میں اضمحلال ظاہر تھا، خواص میں پنہاں، علوم کی ترقی کے لیے اکبر اور شاہ جہاں کا زمانہ مناسب ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے آشفتہ مغزوں کو یہ دماغ کہاں تھا کہ وہ متعدد خشک دقیق کتابوں کی تہ سے گوہر آب دار نکال کر لائیں۔

فورٹ ولیم کالج کے منشی زمانے کے تھپیڑے کھا کر چالیس پچاس روپے ماہوار کے لیے کالے کوسوں دور کلکتہ میں ملازم ہوئے۔ غریب الدیار

سکون طبع کے نام سے آشنا نہ تھے۔ سرور نے فسانۂ عجائب بلا کی پریشانیوں میں مرتب کی۔ چند اہل قلم کو کسی حد تک سکون و راحت نصیب بھی ہوئے تو کیا! قوم کی حالت تو منتشر تھی۔ دماغ اس کا اثر کیوں نہ قبول کرتے۔ ایسے عہد میں تخلیق کا حق کیوں کر ادا کیا جاتا۔ داستانوں کا لکھنا سب سے سہل تھا وہ لکھی گئیں۔ یہیں اس بات کا جواب ملتا ہے کہ تقریباً تمام داستانیں ترجمہ کیوں ہیں۔ محض اس لیے کہ ادیبوں کو طبع زاد کام بار خاطر تھا۔ قومی کردار میں زوال آنے کی وجہ سے وہ تن آساں اور سہل پسند ہوگئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایک آسان صنف کی طرف توجہ کی اور وہ بھی فارسی سے منتقل کرلی تاکہ انھیں انشا نگاری کے علاوہ کوئی زحمت نہ کرنی پڑے۔

داستان ایک ہردلعزیز صنف تھی۔ ہمارے انشا پردازوں کو رؤسا کے گوشۂ چشم کی تلاش تھی۔ ان کی داد معیشت کا سامان بھی فراہم کرتی تھی۔ امرا کو فلسفۂ و تاریخ و منطق سے کیا لینا تھا؟ وہ نثر میں کوئی صنف پسند کرتے تھے تو داستان میں ساحری کے ساتھ ساتھ شاعری کا رنگ و آہنگ بھی جھلکتا تھا۔ اس زمانے کی سوسائٹی کا رنگ اس کے چند شعبوں سے معلوم ہوسکتا ہے۔ پتنگ بازی، بٹیربازی، کبوتر بازی، شاہد بازی، امرد بازی وغیرہ۔ سادہ لوح جاہل نواب طرار و بے علم مصاحبوں کے نرغے میں گھرے ہیں، افیون گھل رہی ہے۔ فقرے چست ہورہے ہیں۔ بے پر کی اڑائی جارہی ہے۔ کام جوئی اور عیش کوشیوں کے چرچے ہورہے ہیں۔ کچھ اہل طرب بھی دیوان خانے میں آتی رہتی ہیں، اس فضا میں وہ سنجیدگی کہاں جو علم کے لیے لازم ہے۔ فسانۂ آزاد کے نوابوں کے یہاں فرنگی محلیوں کی کیا قدر ہوسکتی تھی۔ افیون کے نشے کے ساتھ تو داستان امیرحمزہ کی ترنگ ہی سماں باندھتی تھی۔ امرا، مصنفین، عوام تینوں کو داستانوں کی دل کشی راس آتی تھی۔

چیمبرس انسائیکلوپیڈیا کے ایک مضمون نگار کے مطابق قصے وہیں زیادہ ترقی کرتے ہیں جہاں لوگ سب سے زیادہ کاہل ہوتے ہیں۔ یونان میں قصے اس وقت لکھے گئے جب وہ روم کے زیرنگیں ہوگئے۔ روم کا افسانوی ادب اس وقت وجود میں آیا جب آمر شہنشاہوں نے فرد کی آزادی سلب کردی۔ سولھویں صدی میں عربوں سے جہاد ختم ہونے پر اسپین کے باشندوں کو فرصت کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ وہ شجاعی رومان لکھنے لگے۔ ڈان کوئک زاٹ سے بھی زیادہ مضحک قصے لکھ کر ناظرین کو بے وقوف بنایا گیا۔ انیسویں صدی کی دلی اور لکھنؤ میں کاہلی کا قحط نہ تھا۔ داستانیں اردو کے شجاعی رومان ہیں۔ ان کے بیانات ہم عصر سوسائٹی کے مذاق کے عین مطابق تھے۔ داستانوں میں واقعی افیون کی ترنگ پوشیدہ تھی۔ سیاسی اقتدار کے نکل جانے سے سوسائٹی مفلوج ہوگئی تھی لیکن ابھی حکومت کا نشہ موجود تھا۔ عظمت رفتہ خواب سحر گاہی کی طرح حافظے سے محو نہ ہوئی تھی۔ آباو اجداد کی فتوحات کا فخر اپنی بے عملی کی تلافی کررہا تھا۔ پدرم سلطان بود کا طنطنہ موجودہ بے نوائی کی پردہ داری کیے تھا۔ یہ جذبہ داستانوں میں بھرپور طریقے پر ظاہر ہوا۔ ان میں ایسی بادشاہتوں اور ایسی شان وسطوت کا بیان تھا جو ان بیکسوں کے اجداد کو بلکہ تاریخ کے بڑے بڑے شہنشاہوں کو بھی نصیب نہ تھیں۔

داستانوں کے فروغ میں ایک فراری جذبہ بھی کارفرما تھا۔ ان کی دنیا سپنوں کا سنسار تھی جو تلخیوں سے پناہ دیتی تھی۔ یہاں پہنچ کر بے بسی اور بیکسی سے خلاصی ہوجاتی تھی۔ یہاں کوئی بلا موجود نہ تھی، جو تھیں انھیں زیر کرلیا گیا تھا۔ ہیرو اور اس کے رفیقوں کی فتح داستان کے سامعین کی فتح ہے۔ دست و پا کو تکلیف دینے کی ضرورت نہ تھی، ذہن ہی سب ہفت خواں طے کرکے رکھ دیتا تھا۔ تخیل کو ہر قسم کی آزادی دے دی گئی تھی۔ داستان کے ہیرو میں تمام اوصاف جمع کردیے جاتے تھے۔ سننے والوں کے منہ میں پانی بھر آتا۔ زندگی میں جو کچھ انھیں مرغوب تھا، جس کی حسرت تھی وہ سب داستانوں میں موجود تھا۔ پریوں جیسا حسن، رستم جیسی شجاعت، عشق کے معاملے اور پھر وصل کے محاکاتی بیان۔ ایک حسین ولذیذ خواب تھا جس میں وہ کھو جاتے تھے۔ شیخ چلی کے منصوبوں کی طرح خیال ہی خیال میں تمام دولت وعشرت حاصل ہوجاتی تھی۔ تنخواہ دار داستان گو راتوں کو داستانوں کا رس آقا کے گوش گزار کرتا تھا جس سے حضور کے دماغ کو فرحت پہنچانا مقصود تھا۔ داستان گو کا کمال یہ تھا کہ وہ جدھر نواب صاحب کی رغبت دیکھتا اسی سمت داستان کا رخ پھیر دیتا۔ نواب صاحب کو معلوم ہوتا گویا ان کے کسی کردار یا نائب نے مہم سر کرلی۔ اسی کیفیت میں حضور خواب کی دنیا میں تشریف لے جاتے اور وہاں بھی شاید پریوں اور ساحروں کو تسخیر کرتے تھے۔

ذہنی اضمحلال اور سلب عمل نے تخیل کو زیادہ زرخیز اور فرار کو زیادہ پسندیدہ بنا دیا تھا۔ اس کا سب سے قوی اظہار فوق فطرت کی شکل میں ہوا۔ انیسویں صدی تک جن و پری اور جادو ٹونے پر کسی نہ کسی حد تک اعتقاد تھا۔ داستانوں میں فوق فطرت کو انتہا تک پہنچا دیا گیا۔ سامعین اس سب کے سب کو سچ نہ سمجھتے ہوں لیکن اس کے ایک جزو پر ضرور ایمان رکھتے تھے۔ یہ بیانات انھیں اس لیے پسند آتے تھے کہ ان میں سامعین کی طرح کے گوشت پوست کے نحیف انسان کیا کیا عظیم کارنامے انجام دے لیتے تھے۔ انھیں بھی الہ دین کے چراغ یا ہوا پر اڑنے والے غالیچے کی تلاش ہوتی۔ یہ سوچتے کاش ہمیں بھی افراسیاب جادو کا سحر آجائے تو ہم یہ کریں اور وہ کریں۔ کاش کوئی جادو کی چھڑی مل جائے تو پھر دنیا میں اس طرح غلغلہ بپا کردیا جائے۔ پریوں کی کہانیوں کا زہریلا اثر کم از کم وقتی طور پر اچھے سنجیدہ ذہنوں پر بھی کام کرجاتا ہے۔ داستانوں کا مطالعہ ایک ذہنی بیماری ہوتا تھا۔ بعض صورتوں میں یہ ذہنی عیاشی میں بھی مبتلا کردیتا تھا۔ ذہنی عیاشی کے نفسیاتی اثرات عملی عیاشی سے زیادہ مضر ہوتے ہیں۔

شمالی ہند میں داستانوں کا دور دورہ تقریباً ایک صدی تک رہا۔ انیسویں صدی کے آخری ربع میں لکھنؤ میں امیرحمزہ اور بوستان خیال کے قابل قدر دفتر شائع ہوئے۔ اسی عہد میں رام پور میں داستان نویسی عروج پر تھی لیکن ادب پر

ان کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ لکھنؤ کے خوش باشوں میں تو طلسم ہوشربا بیسویں صدی تک کافی مقبول رہی لیکن خواص کا رجحان اس طرف سے ہٹ چکا تھا۔ آخری ربع میں ناولوں کا دور شروع ہوجاتا ہے۔ نذیر احمد نے پہلا ناول لکھ کر داستان کو پیغام مرگ سنا دیا۔ داستان کے زوال کے اسباب بہت روشن ہیں۔ ہر زبان میں اوّل اوّل فوق فطری رومانی قصوں کا رواج رہتا ہے۔ آخر میں ناولوں کی حقیقت نگاری ان کی جگہ لے لیتی ہے۔ جو قوم جتنی جلدی طبعی اور عمرانی سائنسوں کے جدید تخیلات کو گرفت میں لے سکی یعنی ذہنی بلوغ حاصل کرسکی اس میں محیر العقول قصوں نے ناولوں کے لیے میدان خالی کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی ادب میں ناول نگاری کا افتتاح سترھویں صدی میں ہوگیا۔ اردو میں یہ منزل انیسویں صدی کے آخر میں آئی۔

جب ہندوستان کی مرکزی حکومت انگریزوں کے ہاتھ آگئی اور انگریزی تعلیم کا رواج ہوگیا تو قوم کو مغربی علوم اور مغربی خیالات و افکار سے واقفیت ہوئی۔ سائنس نے توہمات کا قلع قمع کردیا۔ اسی دور میں ہماری شاعری میں اصلاح کی جانب پہلے قدم اٹھائے گئے۔ آزاد اور حالی نے نیچرل شاعری کی وکالت کی۔ انجمنوں کے ذریعے منظم کوششوں نے شاعری کا دھارا ہی موڑ دیا۔ اصلاح کا یہ نزلہ کسی حد تک نثر پر بھی پڑا۔ آزاد ''نیرنگِ خیال'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اب وہ زمانہ بھی نہیں کہ ہم لڑکوں کو ایک کہانی طوطے یا مینا کی زبانی سنائیں۔ ترقی کریں تو چار فقیر لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائیں یا پریاں اڑائیں، دیو بتائیں اور ساری رات ان کی باتوں میں گنوائیں۔ اب کچھ اور وقت ہے اس واسطے ہمیں بھی کچھ اور کرنا چاہیے(11)۔''

جس طرح لاہور کی تحریک نے بالخصوص شاعری سے سروکار رکھا اسی طرح علی گڑھ تحریک نے اپنے اظہار کے لیے نثر کا جامہ پسند کیا۔ سرسید نے مذہب اور فلسفہ، تعلیم اور معاشرت میں روایت پرستی اور تنگ نظری کو ختم کرکے تعقل پسندی اور پیروی مغرب کا چلن چلایا۔ انیسویں صدی کے وسط تک اردو کی ادبی نثر میں داستانوں کے علاوہ کسی اور موضوع پر قلم ہی نہیں اٹھایا گیا تھا۔ تاریخ و مذہب پر کچھ کتابیں تھیں بھی تو ادب میں ان کی کوئی جگہ نہ تھی۔ فسانۂ عجائب کے طرز تحریر کا دور تھا۔ سرسید کو علمی مضامین لکھنے کی ضرورت ہوئی۔ علمی مباحثوں اور تہذیبی مناظروں سے انھیں روزانہ سروکار رہتا تھا۔ ان میں سیدھے سادے سائنٹفک اسلوب سے کام لینا پڑا جس کی بدولت اردو میں مضمون نویسی کا رواج ہوا۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے تہذیب الاخلاق میں کثرت سے مضامین لکھے۔ مفید موضوعات پر مستقل کتابیں لکھنے کا بھی رواج ہوگیا۔ اردو کے چار بڑے شمس العلما نذیر احمد، حالی، شبلی اور آزاد میدان میں کود پڑے اور اردو کے دامن کو تنقید، سوانح اور تاریخ کے کئی شاہکاروں سے بھر دیا۔ اس علمی رجحان نے داستانوں کو سکۂ کاسد قرار دے دیا۔ اسے مغربی اثر کہیے یا زمانے کی رفتار، اگر انگریز نہ آتے تب بھی یہ تبدیلی رونما ہوتی۔ اگر مغل سلطنت رہتی تب بھی نئی لہر رکے نہ رکتی۔ شاید نصف صدی کی دیر اور ہوجاتی۔ آخر کار ذہنوں کو بیدار ہونا ہی تھا۔ وقت کی صرصر اپنے زور میں ہر ایک کو اڑا لے جاتی ہے۔

اس دور میں اپنے احوالِ واقعی کا جائزہ لینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ایسے ادب کی ضرورت ہوئی جو غم خوار ہو، ہمدرد ہو۔ ناولوں میں اپنی زندگی کے سچے عکس نظر آئے۔ ان کے کردار ختن و بدخشاں کے نہ تھے۔ ان میں قرون وسطیٰ کے رومان نہیں تھے۔ انیسویں صدی کے کلیم، ظاہر دار بیگ، ابن الوقت، مبتلا، آزاد وغیرہ سب اپنے سماج کی جانی پہچانی شخصیتیں تھیں۔ یہ ہر معرکے میں ہر منزل پر کامیاب نہیں ہوتے تھے۔ انھیں دنیا کے غموں سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ نذیر احمد نے قدیم تہذیب کی خوبیوں پر لیکچر دیے۔ سرشار نے نوابی دنیا کی بوالعجبیوں کا مذاق اڑایا۔ اہل مغرب سے مقابلہ کرکے جدید معاشرت کی برتری دکھائی۔

انیسویں صدی کے آخر میں قوم کی رگوں میں سیاسی بیداری کا لہو گرمانے لگا۔ شہروں میں زندگی مصروف ہوگئی۔ فرصت کسے کہ ضخیم داستانیں پڑھ سکے۔ شاید انیسویں صدی میں تو لوگوں کے پاس وقت تھا بھی لیکن بیسویں صدی میں قطعاً نہیں۔ اب کسے دماغ ہے کہ امیر حمزہ یا بوستانِ خیال پڑھ سکے۔ ایسے حضرات معدودے چند ہوں گے جنھوں نے دونوں میں سے ایک بھی داستان مکمل پڑھی ہو۔ اب اگر طلسم ہوشربا یا بوستانِ خیال خریدنا چاہیں تو معدوم ہیں۔ مختصر داستانوں کا بھی یہی حال ہے۔ اب ان کی اہمیت محض ادب پارے کے طور پر ہے۔ ان کے قدرداں اردو کے ادیب ہی ہیں، قصوں کے شائقین نہیں۔ عام قاری داستانوں کے بجائے بازاری ناولوں کو ترجیح دیتا ہے۔ بیسویں صدی کے ذہن کو داستانیں مضحکہ خیز نظر آتی ہیں۔ ان کی اہمیت آثار قدیمہ کی سی ہے۔ جس طرح عجائب گھروں میں پرانی چیزیں سنبھال کر رکھی جاتی ہیں اسی طرح داستانوں کو ادبی یادگاروں کے طور پر محفوظ رکھا جائے گا۔ یہ ہمارے ماضی کا ورثہ ہیں۔ حال و مستقبل سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔

حواشی:

1. برٹن، انگریزی ترجمہ الف لیلہ جلد دہم، ص 165-164
2. تحفۃ ان فارس، ص-158، بحوالہ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، ص-34)
3. شاہی اسٹیج، ص-33
4. گزشتہ لکھنؤ، از شرر، طبع اول، ص-98
5. شاہی اسٹیج، ص-35
6. فسانۂ عبرت، ص-33 و 76، بحوالہ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، از مسعود حسن رضوی
7. تقریظ طلسم ہوشربا جلد ہفتم، طبع 1892
8. داستاں گوئی، ساقی نومبر-44
9. داستاں گوئی، ساقی نومبر-44
10. خواجہ دل محمد، تحریک دہلی، ستمبر 1957، بحوالہ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، ص-39
11. مرتبہ آغا طاہر، ص-7

گورو کمار

انٹرنیٹ پر روزگار کے بارے میں جانکاری

عصر حاضر میں انٹرنیٹ روزگار کے بارے میں جانکاری فراہم کرنے کا بنیادی ذریعہ بن گیا ہے۔ ہم اس پر روزگار سے متعلق سیکنڈوں میں بالکل صحیح جانکاری حاصل کر سکتے ہیں۔ روزگار کے متلاشی تمام ضروری معلومات آپ مختلف جاب ویب سائٹ سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اس وقت دنیا بھر میں ہزاروں کی تعداد میں اسی طرح کے ویب سائٹ کام کر رہے ہیں۔ ان سے مختلف شعبوں اور سطحوں پر روزگار کے متلاشی حضرات کو روزگار حاصل کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ آپ اپنی پسند کا روزگار اور اس سلسلے میں ماہرین سے کیریئر کے بارے میں صلاح ومشورہ کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں حسب ذیل ویب سائٹیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

http://www.timesjobs.com
http://www.careerage.com
http://www.naukri.com
http://www.monsterindia.com
http://www.placementindia.com
http://www.careerindia.com
http://www.careerbuilder.com

یہ تمام ویب سائٹ روزگار کے آرزومندوں کا اندراج کرتے ہیں اور ان کے کی ورڈ یا شخصی خاکے (بایوڈاٹا)/آن لائن فارم میں درج مہارت خصوصی کے لحاظ سے انھیں روزگار کے بارے میں تازہ ترین معلومات فراہم کرتے ہیں۔

آج کل سرکاری ایجنسیاں اور ادارے بھی اپنے اشتہارات اور درخواست فارم ویب سائٹ/آن لائن فراہم کرنے لگے ہیں۔

کئی ویب سائٹ ایسے ہیں جہاں شخصی خاکہ تیار کرنے (ریزیوم بلڈنگ) کی سہولت دستیاب ہوتی ہے۔ اس سے روزگار تلاش کرنے والوں بالخصوص نوجوانوں کو خاص طور پر مدد ملتی ہے کیونکہ وہ پیشہ ورانہ شخصی کوائف (پروفیشنل ریزیوم) سے ناواقف ہوتے ہیں۔

میجک ریزیوم ٹائمنز ڈاٹ جابز کوم پر روزگار کے بارے میں جانکاری:

ٹائمنز جابز ڈاٹ کوم میجک ریزیوم فراہم کرتا ہے جس میں ماہرین فن مختلف شعبوں اور روزگار کے آرزومندوں کے تجربے کے مراحل کے لحاظ سے پرکشش شخصی کوائف (بایوڈاٹا) تیار کرتے ہیں۔ ان سے امیدواروں کی صلاحیتوں، مہارتوں، تجربے اور تعلیمی لیاقت کے بارے میں ضروری جانکاری حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان خدمات کے لیے اس تنظیم کو کچھ معاوضہ دینا ہوتا ہے۔

ٹائمنز ایسینٹ سے روزگار کے بارے میں جانکاری:

ٹائمنز ایسینٹ سے کسی بھی طرح کے روزگار کے بارے میں عام، تکنیکی اور پیشہ ورانہ نوعیت کی جانکاری حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ جانکاری ہر بدھ کو شائع کی جاتی ہے۔

ریزیوم زیپر:

اس میں ہندوستان اور خلیجی ممالک کے اعلیٰ ترین روزگار دلانے والے مشیر (Placement Consultant) کو شخصی کوائف مہیا کیے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ ہزاروں لوگوں کو روزگار دلوانے میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔

کیریئر ایسٹرو:

اس ویب سائٹ پر روزگار کے ماہرین کے ذریعے آپ کے سوالوں کا جواب دیا جاتا ہے۔ ٹائمنز جابز ڈاٹ کوم کیریئر سے متعلق آپ کے تمام مسائل کے جواب دے گا۔

کیریئر ایج ڈاٹ کوم

امیدواروں کو حسب ذیل مسائل کے بارے میں آن لائن کیریئر کونسلنگ فراہم کی جاتی ہے۔

- ☆ نئی نوکری کے لیے اپنے آپ کو تیار کیجیے۔
- ☆ کیا نوکری کی تلاش نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔
- ☆ کیریئر کا انتخاب
- ☆ عصر حاضر میں روزگار کی حالت
- ☆ انٹرویو کے لیے تشریف لائیں
- ☆ نئی نئی نوکریاں
- ☆ کیریئر کی ترقی
- ☆ انٹرویو کے چند گر
- ☆ بیرون ملک روزگار کی تلاش
- ☆ ہندوستان واپسی
- ☆ کالج سے تازہ دم نوجوان ☆ کیریئر کونسلنگ

نوکری ڈاٹ کوم (naukri.com):

نوکری ڈاٹ کوم کو روزانہ ملاحظہ کرنے والے انسانی وسائل کے منیجر/ تقرر کرنے والے/ مشیر اس ویب سائٹ سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہ ایک سادہ لیکن انتہائی موثر سروس ہے جس نے روزگار کی عالمی منڈی تک انسان کی رسائی ممکن بنادی ہے۔

ریزیوم ڈیولپمنٹ:

نوکری ڈاٹ کوم کو ماہرین کی ٹیم مرتب کرتی ہے۔ اس ٹیم میں اعلیٰ مہارت اور مسلمہ پیشہ ورانہ صلاحیت کے حامل ماہر جو اس شعبے میں کام کا وسیع تجربہ رکھتے ہوں، خدمات انجام دیتے ہیں۔

ریزیوم فلیش:

اس سہولت کے ذریعے امیدواروں کے شخصی کوائف روزگار دلانے والی/ پلیسمنٹ ایجنسیوں کو فراہم کیے جاتے ہیں۔

جاب میل:

اس سروس سے امیدواروں کو روزگار کے ان مواقع سے مطابقت حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے جو ان کی پروفائل یا کی ورڈ سے مناسبت رکھتے ہوں۔ کسی ویب سائٹ پر اندراج سے پہلے چند اہم نکات کو ذہن میں رکھیے۔

1. روزگار کے بارے میں مستند جانکاری فراہم کی جائے۔
2. ای میل میں پتہ بالکل واضح (ایکنو) ہونا چاہیے۔
3. ای میل میں کوئی مذاقیہ/ مزاحیہ لفظ نہیں ہونا چاہیے۔
4. آپ اپنی شخصیت کا مثبت خاکہ پیش کرنے کی کوشش کریں۔
5. اندراج کرانے سے پہلے اس بات کو یقینی بنائیے کہ ویب سائٹ مستند ہو۔
6. نئے ویب سائٹوں پر اندراج سے پرہیز کیجیے۔
7. فیس/ پریمیم ادا کرنے سے پہلے خدمات فراہم کرنے والوں کی ایمانداری اور صداقت کو یقینی بنائیے۔

(بشکریہ "روزگار سماچار" نئی دہلی 11 تا 17 جون 2005)

کلیات محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: سیدہ جعفر

گولکنڈے کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدرآباد کا بنیاد گزار قلی قطب شاہ فنون لطیفہ کا قدر شناس اور خود ایک خوش فکر شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلیات سیدہ جعفر صاحبہ نے تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈے کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدرآباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

صفحات: 823، قیمت -/175 روپے

کلیات سراج

مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صوفی منش شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی شاعری متصوفانہ کیفیات کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات دکنیات کے ماہر پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے بڑی کاوش و کوشش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں مبسوط مقدمہ بھی ہے جس میں سراج کی شخصیت اور شاعری کے اہم پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 732، قیمت: -/138 روپے

کلیات عیش

مرتبہ: ڈاکٹر حبیبہ بانو

حکیم آغا جان عیش دہلوی ذوق، مومن اور غالب کے ہم عصروں میں تھے اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی انھیں رسائی حاصل تھی۔ غالب کی مشکل پسندی پر ان کا طنزیہ قطعہ "مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" مشہور ہے مگر غالب کی وفات پر انھوں نے جو تاریخی قطعہ بند اشعار کہے ہیں، وہ غالب سے ان کی محبت و عقیدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ عیش خوش فکر شاعر تھے اور انھوں نے اپنا مرتب دیوان غزلیات اپنی زندگی ہی میں مرتب کرلیا تھا۔ ڈاکٹر حبیبہ بانو کے مرتب کردہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ وہ دیگر اصناف سخن بھی ہیں جو عیش سے یادگار ہیں۔ مفصل مقدمے کے ساتھ۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 556، قیمت: -/80 روپے

گلشن بے خار

مصنف: نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

یہ اردو شعرا کا مشہور تذکرہ ہے جو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بزبان فارسی قلمبند کیا تھا اور اس کے بعض بیانات، اس دور کے شعرا کا ذکر آئے تو آج بھی دہرائے جاتے ہیں جس سے یہ تاریخی اہمیت کا حامل تذکرہ ہوگیا ہے۔ اس اہم تذکرے کو جو متقدمین سے شیفتہ کے زمانے تک کے ساڑھے چھ سو سے زائد شعرا اور شاعرات کے مختصر کوائف اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے، محترمہ حمیدہ خاتون نے اصل کتاب کے مستند نسخوں کو سامنے رکھ کر سلیس اردو میں منتقل کیا ہے اور شروع میں ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 430، قیمت -/128 روپے

نوٹ: طلبه اور اساتذه کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

اسمت جین، سمراٹ شرما، سوربھ بنرجی ''مائکروسافٹ پاور پوائنٹ'' سے اقتباس

سلائڈ شو کا سیٹ اپ اور اسے چلانا

سلائڈس کو چیک کرنا

اپنے پریزنٹیشن کے سیٹ اپ کو چلانے سے پہلے سب سے اہم کام یہ ہے کہ اس کی غلطیوں کو چیک کیا جائے۔ آپ اپنے سلائڈوں کے اسٹائل چیکر کے ذریعے چیک کرسکتے ہیں۔ سلائڈ چیکر تمام غلطیوں کو چیک کرتا ہے۔ مثلاً کیس (Case) پنکچویشن (Punctuation) اور فونٹس کے نمبر وغیرہ ہماری پریزنٹیشن میں جن کا استعمال ہوا ہو۔

اسٹائل چیکر چلانے کے لیے درج ذیل طریقہ اختیار کیجیے۔

ٹولس مینو میں جائیے اور آپشنز کو سلیکٹ کیجیے، نیز اسٹائل اور اسپیلنگ ٹیب کو سلیکٹ کیجیے۔

اسٹائل آپشن بٹن کو دبائیے اور اسٹائل چیکر ڈائیلاگ باکس ڈسپلے ہو جائے گا۔

اسٹائل چیکر آپشن ڈائیلاگ باکس کیس اور پنکچویشن ٹیب (Case & Punctuation Tab) کے ساتھ نمایاں شکل میں ڈسپلے ہوتا ہے۔

نوٹ: اصلی سیٹنگ کی طرف واپس آنے کے لیے اسٹائل چیکر آپشنز ڈائیلاگ باکس میں ڈیفالٹس بٹن پر کلک کیجیے۔

آپ جو بھی تبدیلی کریں گے وہ پورے پریزنٹیشن میں اپلائی کرے گا۔

اسٹائل چیکر آپشنز ڈائیلاگ باکس کو بند کرنے کے لیے Ok بٹن پر کلک کیجیے۔

اسٹارٹ بٹن پر کلک کیجیے۔

اسٹائل چیکر سلائڈ پریزنٹیشن کو چیک کرتا ہے اور ایک ڈائیلاگ باکس ڈسپلے ہوتا ہے اور اس میں رونما ہونے والے اسٹائل کی خامیوں کی رپورٹ کرتا ہے۔

اسٹائل کی خامیوں کو دیکھ کر آپ انھیں بہتر بنانے کی کوشش کرسکتے ہیں۔

اسٹائل چیکر سمری ڈائیلاگ باکس ڈسپلے کرتا ہے۔ آپ ان تبدیلیوں کا مشاہدہ کرسکتے ہیں، جو آپ نے کی ہیں۔ اسٹائل چیکر سمری ڈائیلاگ باکس کو بند کرنے کے لیے OK بٹن پر کلک کیجیے۔

پریزنٹیشن کمپوننٹس کے لیے سیٹ اپ کا انتخاب

بطور ایک لائن اسکرین سلائڈ شو کے آپ کسی پریزنٹیشن کو ڈسپلے کرسکتے ہیں۔ 35 ایم ایم (ملی میٹر) سلائڈ بطور اور ہیڈس یا دیگر پرنٹ شدہ آؤٹ پٹ کے ٹائپ کے طور پر ہوسکتا ہے۔ اسی طرح آپ پریزنٹیشن کے دوسرے پراپرٹیز کو بھی متعین کرسکتے ہیں اور پاور پوائنٹ آپ کے انتخاب کے مطابق پریزنٹیشن کو اڈجسٹ کرلے گا۔ اس وقت ہم ان اسکرین سلائڈ شو کی سفارش تو کرتے ہیں لیکن جس وقت آپ پاور پوائنٹ کے ساتھ زیادہ دیر گھر پر ہوں گے تو مختلف قسم کے پریزنٹیشن کرنے کی کوشش کریں۔

سلائڈس، نوٹس، ہینڈ آؤٹس اور آؤٹ لائنس کے سیٹ اپ کے لیے درج ذیل طریقے مہیا کراتے ہیں۔ اس پریزنٹیشن کو کھولیے جس کے سیٹ اپ کو متعین کرنا چاہتے ہیں۔

فائل مینو کے پیج سیٹ اپ آپشن (Page Set up option) کو سلیکٹ کیجیے۔

پیج سیٹ اپ ڈائیلاگ باکس ڈسپلے ہوگا۔

● نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کمیونیکیشن اینڈ انفارمیشن ریسورسیز سی.ایس.آئی.آر یونٹ نے طلبہ اور عام شائقین میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کی فروغ کے لیے ''سب کے لیے آئی ٹی سیریز'' کے تحت ایسی کتابیں تیار کی ہیں جو کمپیوٹر سے متعلق بنیادی باتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ قارئین ''اردو دنیا'' کے لیے اس سیریز کی کتاب ''مائکروسافٹ پاور پوائنٹ'' سے اقتباس پیش ہے۔

سلائڈس سائز فار ڈراپ ڈاؤن لسٹ سے کوئی مناسب سے آپشن کو سلیکٹ کیجیے۔ ذیل کے ڈسکرپشن سے آپشنوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

آپشن	ڈسکرپشن (وضاحت)
ان اسکرین شو	یہ 10 انچ چوڑی اور 7.5 انچ لمبی جگہ لیتا ہے تا کہ سلائڈس اسکرین پر آسکیں۔
لیٹر پیپر (انچ 8.5*11)	یہ 11 انچ چوڑی اور 8.5 انچ لمبی جگہ لیتا ہے۔
اے فور (A4) پیپر (210*297)	10.88 انچ چوڑی اور 7.5 انچ لمبی جگہ لیتا ہے۔
35 ایم ایم سلائڈس	یہ 11.25 انچ چوڑی اور 7.5 انچ لمبی جگہ لیتا ہے تا کہ پورا ٹیکسٹ سلائڈ ہیڈ ٹرانسپرنسی ایریا کو پورا کرے۔
وور ہیڈ	10 انچ چوڑی اور 7.5 انچ لمبی جگہ لیتا ہے تا کہ ٹیکسٹ متعین اور ہیڈ ٹرانسپرنسی ایریا کو پورا کرے۔
بینر	یہ 8 انچ چوڑی اور 1 انچ لمبی جگہ لیتا ہے تا کہ بینر کو بنایا جا سکے۔
کسٹم	یہ ایک خاص سمت کا تعین کرنے میں آپ کی مدد کرتا ہے جب آپ غیر معیاری پیپر پر پرنٹنگ کرتے ہیں۔

ایک کسٹم سائز/کی لمبائی چوڑائی متعین کرنے کے لیے ایرو کیز کا استعمال کیجیے۔

نمبر سلائڈ فروم (Number slide from) باکس کے اندر 1 کے علاوہ کوئی نمبر ڈالیے۔

سلائڈ کے پرنٹ اورینٹیشن کو بدلنے کے لیے یا تو پورٹریٹ (Portrait) یا لینڈ اسکیپ (Land Scape) آپشن کو سلیکٹ کیجیے۔

ڈائیلاگ باکس کو بند کرنے کے لیے OK بٹن پر کلک کریں۔

ابھی تو یہ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوگا لیکن جب آپ دوسرے قسم کے پریزنٹیشن کا ارادہ کریں گے، تو یہ ٹول بہت مفید ثابت ہوں گے۔

سلائڈ شو چلانا

پاور پوائنٹ کے اندر سلائڈ شو کو چلانے کے لیے درج طریقہ اختیار کریں:

اپنے پریزنٹیشن کو Open کریں اور کچھ ویوز کو سلیکٹ کریں مثلاً سلائڈ، آؤٹ لائن، سلائڈ سارٹر، نارمل اور سلائڈ شو وغیرہ۔

سلائڈ شو کے مینو کے سیٹ اپ شو آپشن کو سلیکٹ کریں۔

سیٹ اپ شو ڈائیلاگ باکس ڈسپلے ہوگا۔

ڈائیلاگ باکس کے سلائڈس ایریا کے اندر آل (All) سلیکٹ کیجیے۔ یا کوئی خاص سلائڈ نمبر یا کوئی رینج مثلاً 4-1 جسے آپ پرنٹ کرنا چاہتے ہیں، متعین کریں۔

ایڈوانسڈ سلائڈس ایریا کے اندر مینول (manual) طریقے سے جو آپ چاہیں سلیکٹ کر سکتے ہیں یا ٹائمنگ کا استعمال کرتے ہوئے اسے سلیکٹ کیجیے اگر یہ آپشن موجود ہو اور پریزنٹیشن آٹومیٹک چلانا چاہتے ہیں۔

مسلسل لوپنگ پریزنٹیشن کے لیے لوپ کانٹی نیوسلی انٹل اسکیپ چیک باکس (Loop Continuously until 'Esc' check Box) کیجیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا سلائڈ شو برابر ایک سرکل کے اندر چلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ آپ اسکیپ بٹن کو دبائیں۔

اپنے پریزنٹیشن کو پورے اسکرین پر لانے کے لیے یا تو Presented by a Speaker (یعنی پورا اسکرین) یا Browse at a kiosk (پورا اسکرین) ریڈیو بٹن سلیکٹ کریں۔

ٹرانزیشن اور سلائڈ ٹائمنگس کی سیٹنگ

اگر آپ اپنے پریزنٹیشن کو مزید دلچسپ بنانا چاہتے ہیں تو سلائڈوں کے بیچ میں ٹرانزیشن اسٹائل (Transition Style) کا استعمال کر سکتے ہیں۔

ٹرانزیشن اسٹائل سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ایک سلائڈ کیسے ختم ہوتا ہے اور دوسرا کیسے نمودار ہوتا ہے۔

ٹرانزیشن کنٹرول کرنے کے لیے درج ذیل طریقہ اختیار کریں:

سلائڈ سارٹروں کو سلیکٹ کریں۔
اس سلائڈ کو سلیکٹ کریں جس میں ٹائمنگ اور ٹرانزیشن سیٹ کرنا چاہتے ہیں۔ کئی ایک سلائڈس کو ایک ساتھ سلیکٹ کرنے کے لیے شفٹ کی دبا کر سبھی سلائڈس کو سلیکٹ کرتے جایئے۔
سلائڈ ٹرانزیشن آپشن کو سلائڈ شو مینو سے سلیکٹ کریں۔
سلائڈ ٹرانزیشن ڈائیلاگ باکس ڈسپلے ہوگا۔
افیکٹ ڈراپ ڈاؤن لسٹ سے موزوں ترین ٹراجیکشن اسٹائل سلیکٹ کریں۔
موزوں ترین اسپیڈ آپشن کو سلیکٹ کریں۔
دو سلائڈوں کے درمیان ٹائم سیٹ کرنے کے لیے اڈوانس ایریا کے کسی آپشن کو سلیکٹ کریں۔
اگر آپ آٹومیٹیکلی آفٹر (ٹائم) آپشن کو منتخب کرتے ہیں تو سیٹ کیا ہوا ٹائم ختم ہوتے ہی دوسرا سلائڈ ڈسپلے ہو جائے گا۔
اگر آپ ساؤنڈ کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو ساؤنڈ ڈراپ ڈاؤن لسٹ سے کوئی مناسب آپشن سلیکٹ کریں، اگر آپ مسلسل لوپ ساؤنڈ کو لانا چاہتے ہیں تو (Loop Until neat Sound option) کو سلیکٹ کریں۔ اگرچہ ہمیں اعتراف ہے کہ یہ آپشن ہمارے لیے بہت سی مشکلیں کھڑی کر سکتا ہے۔
صرف حالیہ چل رہے سلائڈ کو، یا تمام سلائڈوں کو، یا پریزنٹیشن کے تمام سلائڈوں کو اپلائی کرانے کے لیے اپلائی بٹن پر کلک کریں۔

سلائڈ شو کو آٹو میٹک بنانا

اب آپ اپنے پریزنٹیشن کے دوران کامیاب سلائڈوں کی طرف خود بخود بڑھ سکتے ہیں اور سلائڈ ٹائمنگس بھی سیٹ کر سکتے ہیں۔ کامیاب سلائڈوں کے ایڈوانسمنٹ کو کنٹرول کرنے کے لیے۔ کیا آپ اپنے پریزنٹیشن کے آزمائشی نمائش کے دوران بھی سلائڈ ٹائمنگ سیٹ کر سکتے ہیں۔
سلائڈ شو کو آٹو میٹک کرنے کے لیے درج ذیل طریقہ اختیار کریں۔
سلائڈ شو مینو سے ریہرسل ٹائمنگ آپشن (Rehearsal Timing Option) سلیکٹ کریں۔
ریہرسل ڈائیلاگ باکس ڈسپلے ہوگا۔
اگر آپ اگلے سلائڈ پر جانا چاہتے ہیں تو ریہرسل ڈائیلاگ باکس کے ایرو بٹن پر کلک کریں۔
اس عمل کو بار بار دہراتے رہیں یہاں تک کہ تمام سلائڈوں کو دیکھ لیں۔
نیو سلائڈ ٹائمنگس سے متعلق مکمل وقت سے آپ کو مطلع کرانے والا ایک میسیج (Message) ڈسپلے ہوگا۔ Yes آپشن کو سلیکٹ کریں۔ نئے وقت کو ریکارڈ کرنے کے لیے یا نئے وقت کو نظر انداز کرنے اور سابقہ وقت کو استعمال کرنے کے لیے No آپشن کو سلیکٹ کریں۔

سلائڈ کے اوپر آبجکٹس کو انیمیٹ کرنا

آپ نے ابھی ابھی سلائڈوں کو انیمیٹ کیا ہے لیکن سلائڈوں کے کمپوننٹس کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ بلٹوں کے علاوہ آپ سلائڈ کے کسی بھی آبجیکٹ کے لیے افکٹس کو بنا سکتے ہیں اور اسے انیمیٹ کر سکتے ہیں انیمیشن افکٹ ایک حرکاتی افیکٹ ہوتا ہے جو یہ طے کرتا ہے کہ پریزنٹیشن کے دوران آپ کے سلائڈ پر کوئی آبجیکٹ کیسا دکھائی دیتا ہے۔
انیمیشن افکٹوں کا اضافہ کرنے کے لیے درج ذیل طریقہ اختیار کریں۔
سلائڈوں کے جس آبجیکٹ کو آپ انیمیٹ کرنا چاہتے ہیں اسے سلیکٹ کریں۔
فارمیٹنگ ٹول بار کے انیمیشن افکٹس بٹن پر کلک کریں۔
ایک انیمیشن افکٹس ٹول بار ڈسپلے ہوگا۔
اپنے آبجیکٹ کے اندر انیمیشن کا استعمال کرنے کے لیے انیمیشن بٹنوں پر کلک کریں۔

نام	فنکشن
اینیمیٹ ٹائٹل	سلائڈوں فائلوں کا ٹائٹل اوپری سطح پر تیرتا ہوا نظر آتا ہے۔
اینیمیٹ سلائڈ ٹیکسٹ	اینیمیٹ سلائڈوں کو ہٹاتا اور سلائڈ شو کے اندر ٹرانزیشن کا اضافہ کرتا ہے۔
ڈرائیو ان ایفیکٹ	کار کی آواز کے ساتھ آبجیکٹ دائیں طرف سے چلتا رہتا ہے۔
فلائنگ ایفیکٹ	ہوش (Whoosh) کی آواز کے ساتھ آبجیکٹ بائیں طرف سے چلتا رہتا ہے۔
کیمرا ایفیکٹ	آبجیکٹ بیچ سے باہر کی طرف نکلتا ہے اور اس میں سے کیمرے کی آواز آتی ہے۔
فلیش ونس	آبجیکٹ پر ہلکی روشنی بکھیرتا ہے اور بند ہو جاتا ہے۔
لیزر ٹیکسٹ ایفیکٹ	اوپر کی طرف دائیں جانب سے ایک ایک حرف گرتا ہے اور اس کے اندر سے لیزر ساؤنڈ نکلتی ہے۔
ٹائپ رائٹر ایفیکٹ	ٹائپ رائٹر کی آواز کے ساتھ ایک ایک حرف کا اضافہ کرتا ہے۔
ریورس آرڈر بلٹ	ٹیکسٹ کو بائیں سے دائیں کی طرف بڑی تیزی سے لاتا ہے۔ اگر بلٹ سلیکٹ کیا ہوا ہو تو بلٹ کو ریورس آرڈر میں کر دیتا ہے۔
ڈراپ ان ٹیکسٹ ایفیکٹ اینیمیشن آرڈر	ایک وقت میں ایک لفظ نیچے کی طرف گراتا ہے۔
اینیمیشن آرڈر	اگر سلائڈ میں بہت سے آبجکٹس ہیں تو ہر ایک اینیمیشن ایفکٹ کے لیے آرڈر سلیکٹ کرتا ہے۔
کسٹم اینیمیشن سیٹنگس	اینیمیشن سیٹنگ ڈائیلاگ باکس کو کھولتا ہے جو پہلے سے موجود سیٹنگس کو دکھاتا ہے اور اینیمیشن ایفکٹس ڈائیلاگ باکس کے علاوہ دوسرے بہت سے آپشن فراہم کرتا ہے۔

پریزنٹیشن کے دوران آبجکٹس کو انسرٹ کرنا

ایک سلائڈ کے اوپر آبجکٹوں اور Text کے درمیان ایک دوسرے پر اثر ڈالنے کے لیے درج ذیل طریقہ اختیار کریں۔

سلائڈ کے اوپر کا آبجیکٹ سلیکٹ کریں۔

سلائڈ شو مینو کے ایکشن سیٹنگ آپشن کو سلیکٹ کریں۔

ایکشن سیٹنگ باکس ڈسپلے ہوگا۔

ڈائیلاگ باکس کے درج ذیل آپشنز کو سلیکٹ کریں:

ماؤس کلک پر کوئی ایکشن نہ ہونے کے لیے آپشن "New" کو سلیکٹ کریں۔

"Hyperlink to" آپشن کو سلیکٹ کریں۔ اس سیٹنگ کا استعمال کر کے ایک ہی پریزنٹیشن کے اندر بہت سارے کسٹم شو بنا سکتے ہیں۔ مختلف سلائڈوں کو چلا سکتے ہیں اور اسے مختلف شکل میں پیش کر سکتے ہیں۔

ایپلیکیشن کو کھولنے کے لیے رن پروگرام آپشن کو سلیکٹ کریں اور ٹیکسٹ باکس کے اندر ایپلیکیشن کا نام ٹائپ کریں، یا براؤز بٹن کے ذریعے پروگرام کو کھولیں۔

مجمد (Embedded) فائلوں مثلاً ورڈ ڈاکومنٹ، ایکسل اسپریڈشیٹ یا دیگر پاور پوائنٹ پریزنٹیشن کے لیے آبجیکٹ آپشن کو سلیکٹ کریں اور پل ڈاؤن لسٹ سے کسی ایک آپشن کو سلیکٹ کریں۔

آپشنوں کو سلیکٹ کرنے کے بعد OK بٹن پر کلک کریں۔

آپ ایکشن بٹنوں کو کسی سلائڈ کے اوپر بھی رکھ سکتے ہیں اور جب اس بٹن پر کلک کریں گے طے شدہ عمل نافذ ہونے لگے گا۔

ایکشن بٹن کو کسی جگہ رکھنے کے لیے درج ذیل طریقہ استعمال کریں:

ایکشن بٹن آپشن کو سلائڈ شو مینو سے سلیکٹ کریں۔

سلائڈ مینو ڈسپلے ہوگا۔ اپنے سلائڈ کے اندر انسرٹ کرانے کے لیے سلائڈ مینو کے کسی بھی بٹن کو سلیکٹ کریں۔ اسی طرح بٹن کے ساتھ ایکشن کا اضافہ کریں۔

محمد فیروز کوئز

اردو زبان و ادب

کوئز کے صحیح جوابات بھیجنے والے قارئین کو بالترتیب پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام دیا جائے گا۔ پہلا انعام 500 روپے، دوسرا انعام 300 روپے اور تیسرا انعام 200 روپے پر مشتمل ہے۔ انعام کے طور پر کونسل کی مطبوعات ارسال کی جائیں گی۔ آپ کے جوابات ہمیں اس مہینے کی 15 تاریخ تک موصول ہو جانے چاہئیں۔ (ادارہ)

(1) زبانوں کے خاندانوں میں سب سے بڑا اور اہم خاندان کون سا ہے؟
(الف) دراوڑی (ب) ہند یوروپی
(ج) افرو ایشیائی (د) آسٹرو ایشیائی

(2) دکن کے سب سے بڑے ریختی گو شاعر کا نام بتائیے؟
(الف) سید میراں ہاشمی (ب) سید محمد قادری خاکی
(ج) بدرالدین خاں لائق (د) گلاب سنگھ ہمدم

(3) سید امداد امام اثر کی مشہور تصنیف "کاشف الحقائق" پہلی بار کب شائع ہوئی؟
(الف) 1890 (ب) 1892
(ج) 1895 (د) 1897

(4) ایس ڈبلیو فیلن نے کس اردو شاعر کو شیکسپیئر قرار دیا ہے؟
(الف) میر حسن (ب) انشاء اللہ خاں
(ج) نظیر اکبرآبادی (د) میر انیس

(5) قصہ "مہر افروز دلبر" کس نے لکھا تھا؟
(الف) خوانی خاں (ب) عیسوی خاں
(ج) کاظم علی جواں (د) مظہر علی خاں ولا

(6) سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی پہلے کہاں قائم کی تھی؟
(الف) بجنور (ب) غازی پور
(ج) علی گڑھ (د) دہلی

(7) سید علی بلگرامی نے کس فرانسیسی مستشرق کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا تھا؟
(الف) گارساں دتاسی (ب) گستاولیبان
(ج) ایملی زولا (د) ہائی نے ہنرچ

(8) کلیات سراج اورنگ آبادی کے مرتب کا نام بتائیے؟
(الف) محی الدین قادری زور (ب) عبدالقادر سروری
(ج) نصیرالدین ہاشمی (د) سیدہ جعفر

(9) ذیل کے شعرا میں سے کون ہمیشہ دلی میں رہا؟
(الف) میر تقی میر (ب) غلام ہمدانی مصحفی
(ج) محمد رفیع سودا (د) خواجہ میر درد

(10) تذکرہ "خم خانۂ جاوید" کا مصنف کون ہے؟
(الف) مصطفےٰ علی خاں شیفتہ (ب) لالہ سری رام
(ج) مرزا علی لطف (د) منشی کریم الدین

(11) "بکٹ کہانی" کس شعری صنف کی نمائندگی کرتی ہے؟
(الف) واسوخت (ب) بارہ ماسہ
(ج) مثنوی (د) ریختی

(12) "خوجی" کس ناول کا مشہور کردار ہے؟
(الف) فسانۂ عجائب (ب) فسانۂ آزاد
(ج) فسانۂ مبتلا (د) خدائی فوجدار

(13) "ہائیکو" کس زبان کی شعری صنف ہے؟
(الف) فرانسیسی (ب) جرمنی
(ج) جاپانی (د) روسی

(14) مخمس کے ہر بند میں کتنے مصرعے ہوتے ہیں؟
(الف) تین (ب) چار
(ج) پانچ (د) چھ

(15) "اردو شاعری پر ایک نظر" کس نقاد نے لکھی ہے؟
(الف) احتشام حسین (ب) عبادت بریلوی
(ج) مجنوں گورکھپوری (د) کلیم الدین احمد

(16) مندرجہ ذیل شعر کس شاعر کا ہے؟
اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام سہی عرفان محبت عام نہیں
(الف) حسرت موہانی (ب) اصغر گونڈوی
(ج) جگر مرادآبادی (د) مخمور دہلوی

(17) میر تقی میر نے اپنی شاعری کو کس کا مجموعہ قرار دیا تھا؟
(الف) یاسیت (ب) درد وغم
(ج) حسن و عشق (د) ناموس عشق

(18) کس شاعر کو "خاقانی ہند" کہا جاتا ہے؟

(الف) شاہ حاتم (ب) شاہ نصیر

(ج) شیخ ابراہیم ذوق (د) مرزا غالب

(19) ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ایک وید مقدس دوسری دیوان غالب۔۔۔ یہ کس کا قول ہے؟

(الف) فراق گورکھپوری (ب) عبدالرحمٰن بجنوری

(ج) رشید احمد صدیقی (د) شیخ محمد اکرام

(20) الطاف حسین حالی کی پہلی سوانحی تصنیف کا نام بتایئے؟

(الف) یادگار غالب (ب) حیات جاوید

(ج) حیات سعدی (د) ان میں سے کوئی نہیں

(21) ناول "صورت الخیال" کا مصنف کون ہے؟

(الف) نذیر احمد (ب) شاد عظیم آبادی

(ج) نذر سجاد حیدر (د) عبدالحلیم شرر

(22) "ایسی بلندی ایسی پستی" کس کا ناول ہے؟

(الف) ابراہیم جلیس (ب) رضیہ سجاد ظہیر

(ج) عزیز احمد (د) قرۃ العین حیدر

(23) سر عبدالقادر نے کون سا رسالہ جاری کیا تھا؟

(الف) نیرنگ خیال (ب) مخزن

(ج) ہمایوں (د) عالمگیر

(24) ذیل کی کس مثنوی میں فوق الفطری عناصر کی بہتات ہے؟

(الف) خواب وخیال (ب) سحرالبیان

(ج) گلزار نسیم (د) دریائے عشق

(25) یہ کس کا شعر ہے؟

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

(الف) آتش (ب) ناسخ

(ج) انیس (د) دبیر

(26) "جام سرور" کس شاعر کا مجموعۂ کلام ہے؟

(الف) جوش ملیح آبادی (ب) جگت موہن لال رواں

(ج) درگا سہائے سرور جہاں آبادی (د) آل احمد سرور

(27) مجروح سلطانپوری کا مجموعۂ کلام پہلی بار کس نام سے شائع ہوا تھا؟

(الف) آہنگ (ب) فروزاں

(ج) غزل (د) مشعل جاں

(28) دلی کی ٹکسالی اور بامحاورہ زبان میں کس ادیب نے شخصی خاکے لکھے ہیں؟

(الف) راشد الخیری (ب) میر ناصر علی

(ج) شاہد احمد دہلوی (د) شوکت تھانوی

(29) کس شاعر نے اپنی نظموں کے بارے میں کہا تھا کہ "اکثریت کی نظمیں الگ ہیں میری نظمیں الگ۔۔۔"؟

(الف) ن.م.راشد (ب) میراجی

(ج) اختر الایمان (د) قیوم نظر

(30) "خدا کی بستی" کس کا ناول ہے؟

(الف) خواجہ احمد عباس (ب) حیات اللہ انصاری

(ج) شوکت صدیقی (د) علی عباس حسینی

(31) کس ادیب نے سب سے پہلے دیہاتی زندگی پر افسانے اور ناول لکھے؟

(الف) پنڈت سدرشن (ب) پریم چند

(ج) کرشن چندر (د) احمد ندیم قاسمی

(32) کس شاعر کے مجموعۂ کلام یا کلیات میں غزلیں نہیں ہیں؟

(الف) مجاز لکھنوی (ب) مخدوم محی الدین

(ج) اختر الایمان (د) کیفی اعظمی

(33) کتاب "اردو مثنوی کا ارتقا" کس کی تصنیف ہے؟

(الف) ڈاکٹر مسیح الزماں (ب) مغیث الدین فریدی

(ج) عبدالقادر سروری (د) آغا محمد باقر

(34) "ایک ادبی ڈائری" کا مصنف کون ہے؟

(الف) خواجہ حسن نظامی (ب) اختر انصاری

(ج) قاضی عبدالغفار (د) حامد حسن قادری

(35) انجمن ترقی اردو کب قائم ہوئی؟

(الف) 1901 (ب) 1902

(ج) 1903 (د) 1905

(36) ڈرامہ "پردۂ غفلت" کس نے لکھا تھا؟

(الف) امتیاز علی تاج (ب) محمد مجیب

(ج) عابد حسین (د) اپندر ناتھ اشک

(37) کس نثر نگار کو مصور فطرت کہا جاتا ہے؟

(الف) کرشن چندر (ب) سعادت حسن منٹو

(ج) خواجہ حسن نظامی (د) اشرف صبوحی

(38) کسی دوسرے شاعر کے مصرعے یا شعر پر مصرعے لگانے کو کیا کہتے ہیں؟

(الف) مستزاد (ب) مسمط

(ج) پیروڈی (د) تضمین

(39) "مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں" کس کی سوانح حیات ہے؟

(الف) صالحہ عابد حسین (ب) غلام السیدین

(ج) خواجہ احمد فاروقی (د) فرحت اللہ بیگ

(40) مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف "غبار خاطر" کا کس نثری صنف سے تعلق

ہے؟

(الف) آپ بیتی　(ب) مکتوب نگاری

(ج) سفرنامہ　(د) تذکرہ

(41) کس ناول میں شعور کی رو کی تکنیک ہے؟

(الف) داراشکوہ　(ب) ضدی

(ج) آگ کا دریا　(د) گردش رنگ چمن

(42) پریم چند کا کون سا افسانوی مجموعہ ضبط کیا گیا تھا؟

(الف) آخری تحفہ　(ب) پریم پچیسی

(ج) واردات　(د) سوز وطن

(43) سجاد ظہیر کا ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' پہلی بار کب شائع ہوا تھا؟

(الف) 1935　(ب) 1936

(ج) 1938　(د) 1939

(44) جدید شاعری کی اولین تحریک کہاں شروع ہوئی؟

(الف) لاہور　(ب) لکھنؤ

(ج) علی گڑھ　(د) دہلی

(45) اس شعر میں کون سی صنعت ہے؟

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

(الف) تضاد　(ب) تلمیح

(ج) لف ونشر　(د) ایہام

(46) ''ہم نفسان رفتہ'' کس کے خاکوں کا مجموعہ ہے؟

(الف) شاہد احمد دہلوی　(ب) محمد طفیل

(ج) رشید احمد صدیقی　(د) اشرف صبوحی

(47) اردو میں لکھے گئے پہلے سفرنامے کا نام بتایئے؟

(الف) نقش فرنگ　(ب) عجائبات فرنگ

(ج) داستان غدر　(د) جرنیلی سڑک

(48) سرسید اور ان کے رفقا کو اردو نثر کے ''عناصر خمسہ'' کس نے کہا تھا؟

(الف) مولوی عبدالحق　(ب) سر عبدالقادر

(ج) مہدی افادی　(د) احسن مارہروی

(49) ''ایوان غزل'' کس کا ناول ہے؟

(الف) عصمت چغتائی　(ب) جیلانی بانو

(ج) واجدہ تبسم　(د) خدیجہ مستور

(50) کس افسانہ نگار کو سال 2003 کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا گیا؟

(الف) جوگندر پال　(ب) سید محمد اشرف

(ج) سلام بن رزاق　(د) سریندر پرکاش

ہمیں اگست کوئز انعامی مقابلے کے متعدد جوابات موصول ہوئے۔

جانچ کے بعد درج ذیل حضرات کو بالترتیب اوّل، دوم اور سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

1. **نیاز سلطانپوری**
معرفت سمیع پبلی کیشنز، بھٹی جرولی،
پوسٹ کٹاواں، ضلع سلطان پور، یوپی-228001

2. **محمد قمرین**
مدنی منزل، اردو بازار، نزد صغریٰ اسکول،
دربھنگہ-846004 (بہار)

3. **علی یاور**
معرفت جہان اردو، رحم گنج، دربھنگہ-846004 (بہار)

انعام یافتگان کو ادارے کی طرف سے مبارک باد۔
آپ کے انعامات جلد ہی بذریعۂ ڈاک ارسال کر دیے جائیں گے۔
(ادارہ)

اگست انعامی مقابلے (کوئز) کے صحیح جوابات:

1. ب	2. الف	3. د	4. ب	5. ج
6. ب	7. ج	8. د	9. ب	10. د
11. ب	12. د	13. ب	14. د	15. ج
16. ج	17. ج	18. ب	19. د	20. ج
21. د	22. ب	23. ب	24. ج	25. د
26. ب	27. ب	28. ج	29. د	30. ب
31. ب	32. د	33. د	34. ج	35. د
36. ب	37. ج	38. ج	39. ج	40. ب
41. ج	42. ج	43. ج	44. ب	45. الف
46. ب	47. د	48. ب	49. ج	50. د

انعام الحق

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو۔26

بڑھتے قدم

محمد افسر کا تعلق دہلی کے ایک متوسط طبقے کے خاندان سے ہے۔ انھوں نے اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول، اجمیری گیٹ دہلی سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پاس کیے۔ بعدازاں دہلی یونیورسٹی سے بی۔اے۔ اور ایم۔اے۔ کرنے کے بعد قومی اردو کونسل کی جانب سے چلائے جانے والے کمپیوٹر سینٹر سے کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی۔ کورس کیا اور آج اسی کورس کی بنیاد پر برسرروزگار ہیں۔ محمد افسر سے کی گئی مختصر گفتگو قارئین "اردو دنیا" کے لیے پیش ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: جب مجھے معلوم ہوا کہ قومی اردو کونسل نے کمپیوٹر سکھانے کے لیے سینٹر قائم کیے ہیں جہاں اردو کے ذریعے کمپیوٹر کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس کے لیے کتابیں بھی اردو میں دستیاب ہیں تو مجھے بہت خوشی ہوئی اور کمپیوٹر سیکھنے کی میری خواہش پوری ہوگئی۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں کے انسٹرکٹر انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو بھی جانتے ہیں اس لیے انھیں سمجھانے اور ہمیں سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ان سینٹروں میں اخراجات بھی بہت معمولی ہیں جو کسی بھی طالب علم کے لیے قابل برداشت ہیں۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جارہی ہے، اُس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: دیگر کمپیوٹر سینٹروں میں کلاس کے اوقات بہت کم ہیں جب کہ کونسل کے سینٹروں میں تقریباً تین چار گھنٹے کی کلاسیں ہوتی ہیں۔ اس سے ہمیں پریکٹیکل کا زیادہ سے زیادہ موقع فراہم ہوتا ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: میں پہلے بے روزگار تھا اس کورس کی بدولت آج دس بارہ ہزار روپے کما رہا ہوں۔ بلاشبہ قومی اردو کونسل کے یہ مراکز اردو داں طبقے کو روزگار کی فراہمی میں کافی حد تک مدد و معاون ثابت ہو رہے ہیں۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں اور پوری دنیا سے وابستہ اور باخبر محسوس کرتا ہوں۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: میں نے اردو میں ایم اے کیا لیکن اس سے فوری طور پر کوئی روزگار یا ملازمت حاصل نہیں ہوئی تھی لیکن کمپیوٹر کورس کرنے کے بعد میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوں۔ اس بنیاد پر میری خود اعتمادی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ آپ اپنی اس انفرادیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: مجھے کئی ایسے کام ملے جو ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ میں اردو، ہندی، انگریزی میں لغت بناتا اور اس طرح کے دیگر کام دوسروں کے مقابلے بہتر طور پر کرتا رہتا ہوں۔ اس طرح ملٹی لنگول ہونے کی وجہ سے مجھے روزگار کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، اس کی ادائیگی آپ کے لیے بوجھ تو نہ تھی؟

جواب: ویسے تو فیس زیادہ نہیں ہے لیکن اگر فیس میں مزید کمی کی جاسکے تو اقلیتی طبقے کے غریب طلبہ و طالبات اس سے اور زیادہ فیض یاب ہوسکتے ہیں۔

○○○

اردو خبرنامہ

سہ روزہ مذاکرہ "اردو ادب و تہذیب کے ارتقا میں پریم چند اور ان کے معاصرین کی خدمات"

+ لکھنؤ: منشی پریم چند کے 125 ویں یوم ولادت کے موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین، اتر پردیش اردو اکادمی اور جدید مرکز نے مشترکہ طور پر 31 جولائی تا 2 اگست کو لکھنؤ میں سہ روزہ جشن پریم چند کا انعقاد کیا جس میں مختلف شعبۂ ہائے زندگی سے وابستہ محبان پریم چند نے شرکت کی اور ان کی سماجی و ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس تقریب میں ممتاز ادیبوں، نقادوں اور ادبی و سیاسی شخصیات نے حصہ لیا۔ اس مذاکرے کا افتتاح گنا کسان سنستھان کے آڈیٹوریم میں یوپی کانگریس صدر جناب سلمان خورشید اور مشہور فلم اداکار جناب فاروق شیخ نے کیا۔

اس موقعے پر جناب سلمان خورشید نے قومی اردو کونسل کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ منشی پریم چند کا کلیات شائع کر کے کونسل نے ایک اہم فریضہ ادا کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا تعلق ہماری اقدار سے ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اردو زبان کے چاہنے والوں میں ہندوستان کے تمام مذاہب کے ماننے والے شامل ہیں اور یہ اقلیت کی نہیں اکثریت کی زبان ہے۔

جناب فاروق شیخ نے ادیبوں کی ناقدری پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج ہمارے ملک میں کرکٹ کھلاڑیوں اور فلمی اداکاروں کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے لیکن ادیبوں اور شاعروں کا کوئی پرسان حال نہیں۔ مرزا غالب اور منشی پریم چند کی ادبی و سماجی خدمات کے عوض سماج نے انھیں کچھ نہیں دیا۔ انھوں نے شیکسپیئر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جہاں شیکسپیئر کا گھر تھا وہاں آج انٹرنیشنل سینٹر بن گیا ہے اور ان کے ادب پر مبنی لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو ہوتا ہے۔ ہیری پوٹر کی کتابیں خریدنے کے لیے صبح سے ہی لوگ قطار میں کھڑے نظر آتے ہیں لیکن پریم چند کی کتابوں کے تئیں ایسا لگاؤ کیوں نظر نہیں آتا ہے۔

پروفیسر قمر رئیس نے اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ منشی پریم چند کی پہلی تصنیف کو انگریز حکومت نے ضبط کر لیا تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنا نام بدل کر اپنی تصنیفات کے ذریعے ملک کی آزادی اور عورتوں اور پس ماندہ طبقات پر مظالم کے خلاف جدوجہد جاری رکھی۔ انھوں نے مزید کہا کہ موجودہ دور کے سیاستداں آج ملک کے سیکولر ڈھانچہ کو توڑنے کی سازشوں کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں لیکن منشی پریم چند نے 1910 میں اس کے خلاف کتابیں تحریر کیں۔ ادیبوں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ادیب سیاست کے آگے پرچم لے کر چلیں لیکن آج تصویر اس کے برعکس ہے۔

بزرگ ادیب کامتا ناتھ نے صدارتی تقریر میں پریم چند کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تحریروں میں وقت کی نبض دھڑکتی ہے۔ کسی بھی ادیب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جو کچھ لکھے اس میں وقت کی نبض دھڑکتی ہو۔ ان معنوں میں پریم چند دوسرے ادیبوں سے بہت آگے ہیں۔ پریم چند نے جو کچھ لکھا اس میں اس زمانے کی تحریکوں، عورتوں پر مظالم، دلتوں کا استحصال، غریبوں و مزدوروں کی حالت، سب کا ذکر ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو اپنے آپ میں زبان کے ساتھ تہذیب بھی ہے۔

کلیات پریم چند کے مرتب جناب مدن گوپال نے کہا کہ بیرونی ممالک میں لوگ رویندر ناتھ ٹیگور کے بعد اگر کسی کو جانتے ہیں تو وہ پریم چند ہیں۔ اس موقعے پر جناب سلمان خورشید اور جناب فاروق شیخ کے ہاتھوں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ 24 جلدوں پر مشتمل "کلیات پریم چند" کا اجرا عمل میں آیا۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اس موقعے پر اردو

حسام صدیقی فلم سنسر بورڈ کے رکن

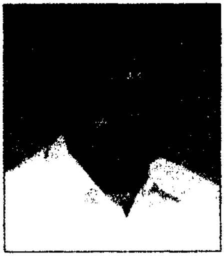

+ لکھنؤ، 20 جولائی۔ اردو اور ہندی میں لکھنؤ، دہلی اور ممبئی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ "جدید مرکز" کے مدیر جناب حسام الاسلام صدیقی کو مرکزی حکومت نے سنٹرل بورڈ آف فلم سرٹیفکیشن کا رکن نامزد کیا ہے۔ جناب صدیقی کو امریکہ، انگلینڈ، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، چین، جاپان اور ملیشیا سمیت تقریباً دو درجن ممالک میں جانے اور وہاں کی صحافت، ثقافت اور فلموں کو قریب سے دیکھنے کا تجربہ ہے۔ وہ اتر پردیش کے پہلے صحافی ہیں جنھیں یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔

(دی ایشین ایج، نئی دہلی)

زبان و ادب اور تعلیم کے فروغ کے لیے کونسل کی جانب سے کیے جانے والے اقدامات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کونسل اردو کے کلاسیکی ادبی سرمائے کی اشاعت پر خصوصی توجہ دے رہی ہے اور چوبیس جلدوں میں کلیات پریم چند کی اشاعت اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ پریم چند نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں جس طبقے کو موضوع بنایا، آج وہ طبقہ نئی سماجی تبدیلیوں کے ساتھ ہندوستان کے سیکولر جمہوری نظام میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

سیمینار کے کنوینر اور ہفت "جدید مرکز" کے مدیر جناب حسام الاسلام صدیقی نے افتتاحی اجلاس کی نظامت کے فرائض انجام دیے اور جناب وسیم نے مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ جلسے میں کونسل کی طرف سے لکھنؤ میں چلائے جا رہے کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی کورس کے کامیاب طلبہ و طالبات کو اسناد بھی تقسیم کیے گئے۔ ظفر علی نقوی، پرمود تیواری اور کملا ناتھ نے بھی اس تقریب میں شرکت کی۔

سیمینار کے دوسرے اور تیسرے دن کے اجلاس جے شنکر ہال میں منعقد کیے گئے۔ دوسرے دن کے پہلے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے صدر جلسہ ڈاکٹر قمر رئیس نے کہا کہ پریم چند غیر ملکی حکومت سے نفرت کرتے تھے اور اس کا اظہار ان کی کہانیوں میں بھی ہوا ہے۔ پریم چند مرتے دم تک ہندو مسلم اتحاد کے حامی رہے۔

اس اجلاس کا پہلا مقالہ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے پیش کیا جس کا موضوع "پریم چند کی حقیقت نگاری" تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر واحد قریشی نے "پریم چند کا تصور حقیقت نگاری" اور ڈاکٹر صغیر ابراہیم نے "پریم چند اپنے خطوط کے آئینے میں" کے موضوع پر مقالے پڑھے۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، عبدالحمید طرزی، پروفیسر شارب ردولوی، اقبال مجید، رفعت سروش، پروفیسر فضل امام، محمد زماں آزردہ، شہناز نبی، پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی وغیرہ نے پریم چند کی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔

2 راگست کو سیمینار کے آخری دن "پریم چند۔۔۔ اردو صحافت اور فلمی دنیا" اور "پریم چند کا اثر اور جدید ادب" کے زیر عنوان اجلاس منعقد ہوئے۔ اس موقعے پر ممتاز ناول نگار جیلانی بانو نے کہا کہ پریم چند کے ادب میں اس عہد کی سچی تصویر نظر آتی ہے۔ جناب ارون کول نے بھی جلسے کو خطاب کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر شیما رضوی، سلیمان اطہر جاوید اور حسام الاسلام صدیقی وغیرہ خصوصی طور پر موجود تھے۔

سیمینار کے اختتامی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے کہا ہماری مشترکہ تہذیب اور سیکولر جمہوری روایات کی آبیاری اور اس کو پروان چڑھانے میں منشی پریم چند کا اہم کردار رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو قلم کاروں نے تصور آزادی کو ابھارنے اور ملک کو آزاد کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ منشی پریم چند نے تو اردو ہی سے اپنی ادبی زندگی کی شروعات کی لہٰذا اردو والوں کا ان پر حق بھی زیادہ بنتا ہے اور اردو والے یہ حق ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ "کلیات پریم چند" کی اشاعت اس کا ثبوت ہے۔ انھوں نے اردو زبان و ادب اور تعلیم کے فروغ کے لیے کونسل کی جانب سے کیے جانے والے اقدامات سے بھی واقف کرایا۔

مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کا پہلا جلسہ تقسیم اسناد

حیدرآباد 5 راگست۔ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے عبدالکلام نے اساتذہ برادری پر زور دیا کہ وہ طلبہ میں یہ احساس جاگزیں کریں کہ ان کی ترقی و فروغ میں زبان حائل نہیں ہوتی ہے۔ بھارت رتن ڈاکٹر اے۔پی۔جے۔ عبدالکلام مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی کے پہلے جلسہ تقسیم اسناد سے خطاب کر رہے تھے۔ تقریب کی صدارت یونیورسٹی کے چانسلر پروفیسر عبید صدیقی نے کی۔ صدر جمہوریہ نے کہا کہ اردو یونیورسٹی کا ایک مشن یہ ہونا چاہیے کہ زبان کو قومی محاذ پر لایا جائے، یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب زبان کو سائنسی مضامین سے مالا مال کیا جائے۔ زبان کی منفرد مسابقت کو استعمال کرتے ہوئے معیاری ادب فراہم کیا جائے اور تدریسی نصاب و تدریسی پیشہ دریت پیدا کی جائے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو دیگر زبانوں سے الفاظ بالخصوص سائنسی اصطلاحات جذب کرنے کے قابل بنانا چاہیے۔ فیکلٹی کے اراکین کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ طلبہ میں سماج کے لیے درکار صلاحیتوں کو ابھاریں۔ ان کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ٹیکنالوجی کے ذریعے طلبہ میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے ان میں کردار، انسانی اقدار اور سیکھنے کی صلاحیت کو فروغ دیا جائے۔ ڈاکٹر عبدالکلام نے یونیورسٹی کی جانب سے اردو زبان میں تدریس پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس سے طلبہ تصورات کو مزید واضح طریقے سے سمجھ جاتے ہیں چونکہ یہ ان کی مادری زبان ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مادری زبان میں سیکھنا دوسری زبانوں کے مقابل سرعت آمیز عمل ہوتا ہے۔ یہ یونیورسٹی جہاں اردو کے فروغ و ترویج کا کام کر رہی ہے وہیں روایتی طرز تعلیم و فاصلاتی طرز تعلیم کے ذریعے اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور فنی تعلیم بھی فراہم کر رہی ہے۔ یہ تعلیمی پروگرام میں خواتین کی شرکت کو بڑھائے گا اور نتیجتاً خواتین کی خواندگی میں اضافہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کی شناخت اصل میں ادب، شاعری اور غزلوں سے ہے۔ ہندوستان اور بیرون ملک چند اداروں میں اردو یونیورسٹی سطح تک ذریعہ تعلیم بھی ہے حتیٰ کہ میڈیکل اور انجینئرنگ کورس بھی اس زبان میں چلائے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مختلف یونیورسٹیوں میں رائج اردو نصابی کتابوں کو یکجا کرنے اور ان کی ایک حوالہ جاتی کتابیات تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ انٹرپرینیورشپ کے ذریعے فراہمی روزگار پر زور دیا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ طلبہ کو ڈگریوں کے

علاوہ ہنر سے لیس تعلیم اور انٹر پرینیورشپ میں بھی مہارات حاصل کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کے معاشرے کی اردوداں آبادی کو ذی علم کارکنوں میں تبدیل کرنے میں اردو یونیورسٹی کو بہت اہم رول ادا کرنا ہے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ یونیورسٹی، یونیورسٹی ٹیلی ایجوکیشن سسٹم کو اختیار کرے۔ اس موقعے پر ممتاز ماہر تعلیم جناب سید حامد چانسلر ہمدرد یونیورسٹی اور ممتاز مجاہد آزادی ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صدر انجمن ترقی اردو ہند کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں عطا کی گئیں اور میرٹ حاصل کرنے والے بارہ طلبہ میں طلائی تمغے تقسیم کیے گئے۔ ابتدا میں پروفیسر اے ایم پٹھان نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ چانسلر یونیورسٹی پروفیسر عبید صدیقی نے ڈگریاں عطا کیں۔ اس موقعے پر گورنر جھارکھنڈ جناب سبط رضی بھی موجود تھے۔

(سیاست، حیدرآباد)

حالی کی یاد میں مذاکرہ اور مشاعرہ

+ چنڈی گڑھ۔ ہریانہ اردو اکادمی، پنچکولہ کی جانب سے 20 اور 21 رجولائی کو پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ کے آئی سی ایس ایس آر کانفرنس ہال میں مولانا حالی پر دو روزہ ہند و پاک مذاکرہ منعقد کیا گیا جس میں نامور ادبا اور شعرا نے شرکت کی۔ مذاکرے کا افتتاح گورنر ہریانہ ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے کیا۔ وزیر اعلیٰ ہریانہ جناب بھوپندر سنگھ ہڈا نے جلسے کی صدارت کی اور وزیر تعلیم ہریانہ محترم پھول چند ملانا نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ شرکا کا خیر مقدم جناب آر ایس گجرال (آئی اے ایس) فنانشل کمشنر اور پرنسپل سکریٹری محکمہ تعلیم، ہریانہ نے کیا۔

سیمینار کے افتتاحی خطبے میں ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ خواجہ الطاف حسین حالی اردو کے ان شاعروں اور ادیبوں میں ہیں جنھوں نے آسان اردو کو بڑھاوا دیا۔ وہ اردو کو عام بول چال کی زبان بنانا چاہتے تھے۔

جناب بھوپندر سنگھ ہڈا نے کہا کہ حالی نے ہی اردو تنقید کے اصول سب سے پہلے متعین کیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان کی سرکار اردو کے لیے بہت سنجیدہ ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ریاست کے اردو ادیبوں کو سرکار کی جانب سے ریاست ہریانہ کی بسوں میں مفت سفر کی سہولت مہیا کرائی گئی ہے۔ جناب بھوپندر سنگھ نے حالی کو ایک سچا قوم پرست قرار دیتے ہوئے ان کی خدمات سے نئی نسل کو متعارف کرانے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے حالی کے آبائی مکان کو خرید کر وہاں لڑکیوں کے لیے ایک پرائمری اسکول قائم کرنے کا اعلان کیا۔

افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ ڈاکٹر سلیم اختر نے ''کیا آج حالی کی ضرورت ہے'' پیش کیا۔ انھوں نے حالی کو اخلاقیات اور انسانی اقدار سے متاثر تخلیق کار قرار دیا۔

ابتدا میں خطاب کرتے ہوئے سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی جناب کشمیری لال ذاکر نے مذاکرے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ حکومت حالی کے مکان کو یادگار کے طور پر محفوظ کرے۔ ''ہریانہ اور اردو'' کے موضوع پر ڈاکٹر خلیق انجم جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہی وہ ریاست ہے جہاں اردو پروان چڑھی، یہاں حالی، غلام السیدین، صالحہ عابد حسین، خواجہ احمد عباس نے آنکھیں کھولیں۔ جناب وجے وردھن (آئی اے ایس) سکریٹری، گورنر ہریانہ نے حالی اور ان کے عہد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے حالی کو نئے زمانے کا معمار قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے۔ ان کی نظمیں انسانی حقوق کی آئینہ دار ہیں۔

کمشنر تعلیمات، ہریانہ جناب دلیپ سنگھ (آئی اے ایس) نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر اکادمی کے سہ ماہی مجلہ ''جمناتٹ'' کے حالی نمبر، کتاب ''حالی اور سرزمین ہریانہ'' اور حالی کے بارے میں شائع کیے گئے سوونیر کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ جلسے میں ذاکر صاحب کے مشہور ڈرامے ''ایک سفر درد کا'' کی سی ڈی بھی ریلیز کی گئی۔

مذاکرے کے پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی، جناب شاہد ماہلی اور جناب فارق ارگلی نے کی۔ ڈاکٹر کمار پانی پتی نے ''مولانا الطاف حسین حالی اور تہذیب شاعری کی نئی سمتیں'' اور مہندر پرتاپ چاند نے ''حالی کی سیرت کے کچھ امتیازی پہلو'' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر رانا گنوری نے کی۔

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی اور ڈاکٹر طاہر تونسوی نے کی۔ ڈاکٹر فاروق ارگلی نے ''اردو شاعری کی برگزیدہ شخصیت خواجہ الطاف حسین حالی'' اور جناب شاہد ماہلی نے ''حالی'' کے عنوان سے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت جناب شمس تبریزی نے کی۔

تیسرے اور آخری اجلاس کی مجلسِ صدارت میں ڈاکٹر سلیم اختر (لاہور) اور ڈاکٹر خلیق انجم شامل تھے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ''نقدِ شعر کے معیارات و مسائل کا مطالعہ مقدمہ شعر و شاعری اور ہماری شاعری کے تناظر میں'' پروفیسر قاضی جمال حسین نے ''شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ'' پروفیسر شمیم حنفی نے ''حالی اور نشاۃِ ثانیہ'' ڈاکٹر رانا گنوری نے ''سادگی پسند مولانا حالی پانی پتی'' اور ڈاکٹر دیس راج سپرہ نے ''مولانا الطاف حسین حالی اور جدید اردو تنقید'' کے زیر عنوان مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت جناب مہندر پرتاپ چاند نے کی۔ اختتامی اجلاس میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے سیمینار کی تفصیلی رپورٹ پیش کی اور سفارشات کا بھی ذکر کیا جو ہریانہ سرکار کی جانب سے منظور کی گئیں۔ آخر میں اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر نے تمام مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔

20 رجولائی کی شام کو ٹیگور آڈیٹوریم پی جی آئی، چنڈی گڑھ میں ایک

ہندو پاک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی شمع صدر مشاعرہ ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے روشن کی اور جناب پھول چند ملانا نے بحیثیت مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ جناب کشمیری لال ذاکر نے مشاعرے کی نظامت کی۔ اس میں جن شعرا نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی، محترمہ منور سلطانہ (پاکستان)، ڈاکٹر شہریار، جناب مخمور سعیدی، جناب شاہد ماہلی، جناب فاروق ارگلی، محترمہ نسرین نقاش، محترمہ انا دہلوی، جناب کرشن کمار طور، جناب حکم سنگھ رانا، جناب مہندر پرتاپ چاند، جناب کمار پاشی پی، ڈاکٹر رانا گنوری، محترمہ روپا صبا، جناب کشمیری لال ذاکر اور جناب شمس تبریزی۔ (ڈاک سے)

مذاکرہ "اکیسویں صدی میں اردو کا موقف"

✦ حیدرآباد، 26 رمئی۔ کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کی جانب سے "اکیسویں صدی میں اردو کا موقف" کے زیرِ عنوان دو روزہ مذاکرے کا انعقاد مولانا آزاد میموریل گورنمنٹ جونیر کالج، ناپلی میں ہوا، جس کی صدارت جناب محمد جلیل پاشا، بانی و صدر نشیں کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی نے کی۔ مذاکرے کا افتتاح پروفیسر اے. ایم. پٹھان وائس چانسلر مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج اکیسویں صدی میں جب ہم اردو کے موقف کی بات کرتے ہیں تو ہمارا راست مقابلہ عوامی ذرائع ابلاغ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی سے ہے۔ اگر ہم صحیح معنوں میں اردو کو ترقی دلانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں منصوبہ بند طریقے سے اس چنوتی کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اس کے لیے تمام رضا کار تنظیموں کا تعاون، اردو اکادمیوں سے رابطہ اور ایک واضح سمت میں پیش قدمی ضروری ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ اس سلسلے میں بے حد سنجیدہ ہیں اور فراخ دلی سے فروغِ اردو کے لیے فنڈ دے رہے ہیں۔

اس موقعے پر شری. کے. راما کرشنا راؤ، ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن نے اپنی تقریر میں کہا کہ اس بار اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات نے پانچ سو پچاس سے زیادہ نشانات حاصل کیے جن کی تعداد لگ بھگ تیس سے زیادہ ہے اور چار سو سے زائد نشانات حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد پندرہ سو تا دو ہزار ہے۔ انھوں نے جناب جلیل پاشا کے اس مشورے پر سنجیدگی سے غور کرنے کا وعدہ کیا کہ اردو میڈیم طلبہ کو پانچ سو سے زائد نشانات حاصل کرنے پر پرتیبھا ایوارڈ سے نوازا جائے۔ جناب ایم. اے. قدوس، ایڈیشنل سکریٹری اعلیٰ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش نے کہا کہ بہتر ہوگا اگر منڈل کی سطح پر تمام مدارس میں جن کا تدریسی نظام تلگو یا انگریزی ہو، اردو زبان کی تعلیم دی جائے۔ پروفیسر محمود بن محمد، سابق سفیر برائے سعودی عرب نے بھی جلسے میں خطاب کیا۔

اس موقعے پر جناب محمد جلیل پاشا نے کہا کہ اردو زبان کو پیشہ ورانہ کورسوں سے جوڑنے کی ضرورت ہے تاکہ اردو طلبہ میں مایوسی نہ پیدا ہو۔ انھوں نے مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے گذارش کی کہ یونیورسٹی کے ذریعے خواتین کی ناخواندگی کو دور کرنے کے پروگراموں پر زیادہ توجہ دی جائے اور جہاں جہاں ضرورت ہو ملک کے تمام حصوں میں خواتین کے لیے فاصلاتی تعلیمی مراکز قائم کیے جائیں۔ انھوں نے کہا کہ آندھرا پردیش کے جن چودہ اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا گیا ہے وہاں اس پر سختی سے عمل آوری کی جائے۔

انھوں نے ڈی. ای. پی. ای بورڈ میں ایک خصوصی اردو افسر کی تقرری کا بھی مطالبہ کیا۔ انھوں نے ٹیلی ویژن میڈیا کو زیادہ سے زیادہ اردو پروگرام تیار کرنے اور ان کی پیش کش کے لیے اردو زبان کے ماہرین کی خدمات حاصل کرنے کا مشورہ دیا تاکہ اردو والوں کو روزگار حاصل ہو سکے۔

اس موقعے پر پروفیسر ملا ریڈی ڈین فیکلٹی عثمانیہ یونیورسٹی، پروفیسر اقبال علی خاں کاکتیہ یونیورسٹی، پروفیسر اکبر خاں، پروفیسر عرفان علی خاں، پروفیسر مسعود علی خاں، پروفیسر یوسف سرمست، پروفیسر اکرم اللہ خاں، اسحاق اکبر، جناب وویکا نند سوامی، جناب مظاہر حسین، مسز دستا ریڈی، جناب جاوید کمال نے بھی خطاب کیا۔ پروفیسر یوسف کمال مشیر قومی اردو کونسل نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور جناب رئیس اختر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر سید علی پی جی کو آرڈینیٹر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

کل ہند اردو کانفرنس

✦ حیدرآباد، 29 رجولائی۔ صدر پردیش کانگریس ڈاکٹر کے. کیشو راؤ نے کہا کہ اردو کے مسائل حل کرنے کے لیے کانگریس حکومت سنجیدہ ہے۔ وہ یونیورسٹی آڈیٹوریم میں سہ روزہ ستائیسویں کل ہند اردو کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے جس کا انعقاد کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کی جانب سے کیا گیا تھا۔ صدر تعلیمی کمیٹی جناب محمد جلیل پاشا کی صدارت میں منعقدہ اس کانفرنس میں ملک کی مختلف ریاستوں بشمول مہاراشٹر، کیرالا، کرناٹک، دہلی کے علاوہ ریاست کے مختلف اضلاع سے سیکڑوں مندوبین نے شرکت کی۔ ڈاکٹر کیشو راؤ نے اردو اساتذہ کی خالی اسامیوں اور ہر دس طلبہ کے لیے علاحدہ اردو استاد کی تقرری کی یقین دہانی کی۔ ریاستی وزیر اقلیتی بہبود جناب محمد فرید الدین نے کہا کہ ڈاکٹر راج شیکھر ریڈی کی قیادت میں کانگریس حکومت اقلیتوں کے مسائل بالخصوص اردو کے مسائل کے حل میں دلچسپی رکھتی ہے چنانچہ موجودہ بجٹ میں اقلیتی طلبہ کے لیے وظیفے کی رقم میں 5 کروڑ روپے کا اضافہ کیا گیا اور محکمۂ اقلیت کے بجٹ کو 39 کروڑ روپے سے بڑھا کر 49 کروڑ روپے کر دیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ خواندگی میں مسلم اقلیت کا شرح تناسب 18 فیصد ہے جس میں خواتین کا تناسب صرف تین فیصد ہے۔ چنانچہ خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر بلگرامی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے 37 قراردادیں پیش کرتے ہوئے اردو کو سارے ملک میں سرکاری زبان کا درجہ دینے، اردو میڈیم کی تمام خالی اسامیوں کو فوراً پر کرنے، رامپور اور بھوپال میں اردو یونیورسٹی قائم کرنے، اردو

زبان کی ترقی کے لیے منصوبہ بندی کمیشن سے 200 کروڑ روپے منظور کرنے، اردو سرکاری زبان کمیشن قائم کرنے، اردو اساتذہ کے تقررات میں روسٹر نظام نافذ کرنے، مرکزی حکومت کی جانب سے اردو اکادمیوں کو ریاست کے مماثل گرانٹ جاری کرنے، مولانا آزاد یونیورسٹی کے لیے 200 کروڑ روپے اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے لیے 100 کروڑ روپے منظور کرنے کا مطالبہ کیا۔ قبل ازیں ڈاکٹر کیشور راؤ نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی کتابوں کی نمائش کا افتتاح کیا۔ مشیر قومی کونسل پروفیسر یوسف کمال اور دیگر عہدیداران اس موقعے پر موجود تھے۔ آخر میں جناب فہیم الدین نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔
(منصف، حیدرآباد)

مذاکرہ "عصر حاضر کے تقاضے اور دینی مدارس"

حیدرآباد۔ صمدانی کالج عثمان باغ، بہادر پورہ اور مہدی پٹنم چوراہا ملحقہ کالی کٹ یونیورسٹی کی جانب سے منعقدہ مذاکرہ بعنوان "عصر حاضر کے تقاضے اور دینی مدارس" سے خطاب کرتے ہوئے صدر مدرس جامعہ اسلامیہ دارالعلوم سبیل السلام مولانا برکت اللہ قاسمی نے کہا کہ علوم عربیہ اسلامیہ کے طلبہ و فارغین انگریزی زبان سے واقفیت اور عصری جامعات کی اسناد کے ساتھ میدان عمل میں آئیں تو قوم کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں۔ مولانا نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم میں مہارت پیدا کریں تا کہ وہ دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہیں۔ انھوں نے بتایا کہ صمدانی کالج میں کالی کٹ یونیورسٹی کا فاصلاتی مرکز کھل جانے سے مدارس کے طلبہ اور فارغین آسانی سے اپنی تعلیم کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ مولانا صادق محی الدین مفتی جامعہ نظامیہ نے عربی کے ساتھ دیگر زبانوں میں بھی مہارت حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ معاون امیر جماعت اسلامی آندھرا پردیش، اڑیسہ جناب حامد محمد خاں نے کہا کہ پرائمری اسکول میں اگر ایک لاکھ بچے داخلہ لیتے ہیں تو ثانوی درجات تک صرف 15 ہزار بچے پہنچ پاتے ہیں جبکہ انٹرمیڈیٹ میں یہ تعداد گھٹ کر 5 ہزار ہو جاتی ہے اور گریجویشن تک یہ تعداد 0.8 فیصد رہ جاتی ہے۔ ہمیں اس صورت حال پر قابو پانا ہوگا۔ انھوں نے مدارس کے اساتذہ کو تربیت دینے کا مشورہ بھی دیا تا کہ وہ بچوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے انھیں تعلیم دیں۔ ڈاکٹر اسلام الدین مجاہد صدر آل انڈیا اسلامک ٹیچرز ایسوسی ایشن نے کہا کہ موجودہ دور میں کسی بھی قوم کی ترقی کا دارومدار تعلیم پر ہے، جو قوم تعلیمی میدان میں پسماندہ ہوتی ہے وہ زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ ڈائرکٹر صمدانی کالج ڈاکٹر لئیق احمد صدیقی نے کہا کہ ہندوستان میں دینی مدارس کا جال بچھا ہوا ہے ان میں سے بہت کم اداروں کی سند مقامی یونیورسٹیاں تسلیم کرتی ہیں جبکہ اعلیٰ تعلیم، حصول روزگار اور حکومت کی اسکیموں سے استفادے کے لیے ڈگری کی بڑی اہمیت ہے۔ ابتدا میں مولانا خلیل احمد ندوی صدر صمدانی کالج نے صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی کی تعلیمی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ ڈپلوما ان اردو لینگویج، ڈپلوما ان فنکشنل عربی حکومت کے کورس ہیں جو قومی اردو کونسل کے توسط سے چلائے جا رہے ہیں اور کونسل ان کورسوں کی کتابیں مفت فراہم کرتی ہے۔ کالی کٹ یونیورسٹی کا عربی بی اے نصاب کسی بھی دینی ادارے کے نصاب کے مساوی ہے جس کو طلبہ و فارغین آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ توفیق احمد صدیقی نے جلسے کی نظامت کی۔
(ڈاک سے)

عبید صدیقی اردو یونیورسٹی کے چانسلر

+ حیدرآباد، 5/جولائی۔ عالمی شہرت یافتہ سائنسداں اور ماہر تعلیم پروفیسر عبید صدیقی کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا چانسلر مقرر کیا گیا ہے۔ صدر جمہوریہ ہند اور یونیورسٹی کے وزیٹر ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام نے یونیورسٹی کی ایگزیکیٹو کونسل کی جانب سے چانسلر کے عہدے کے لیے پیش کیے گئے ناموں پر غور و خوض کے بعد پروفیسر عبید صدیقی کو تین سال کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا چانسلر نامزد کیا ہے۔ سابق وزیر اعظم جناب اندر کمار گجرال کو 24/مئی 1999 کو یونیورسٹی کا پہلا چانسلر بنایا گیا تھا۔ وہ گزشتہ پانچ برسوں سے یونیورسٹی کے چانسلر کے عہدے پر فائز تھے۔

جناب عبید صدیقی مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کے رجحان کو فروغ دینے والی شخصیت کی حیثیت سے اپنی ایک علاحدہ شناخت رکھتے ہیں۔ وہ نیشنل سنٹر فار بایولوجیکل سائنسیز آف ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامنٹل ریسرچ، بنگلور کے بانی ڈائرکٹر کے علاوہ کئی عالمی سائنسی اداروں کے فیلو بھی ہیں۔ 1932 میں پیدا ہونے والے پروفیسر صدیقی کو رائل سوسائٹی، لندن کا فیلو ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔
(ڈاک سے)

جدہ اردو اکادمی کا جلسہ

+ حیدرآباد، 25/جولائی۔ اردو اکادمی جدہ اور خاک طیبہ ٹرسٹ جدہ کی طرف سے پرکاشم ہال میں منعقدہ ایک تقریب میں اردو میڈیم سے ایس ایس سی میں پہلا مقام حاصل کرنے والے طلبہ کو طلائی تمغے دیے گئے۔ اس موقعے پر کل ہند مشاعرہ بھی منعقد ہوا جس کی صدارت ممتاز مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین نے کی۔ ریاستی وزیر اطلاعات و تعلقات عامہ و توانائی محمد علی شبیر نے طلبہ میں طلائی تمغے تقسیم کرنے کے بعد بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تعلیمی میدان میں قوم کو آگے لانے کا بیڑہ اٹھانا کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں ہے اس کے لیے اجتماعی کوششیں کی جانی چاہیے۔ انھوں نے زور دیا کہ نئی نسل کو تعلیم کے میدان میں آگے بڑھانے کے لیے بستی کی سطح پر کوششیں کی جانی چاہئیں۔ اگر ملت کے متمول افراد اپنی آسائشوں کی قربانی دے کر غریب و نادار طلبہ و طالبات

کے تعلیمی اخراجات برداشت کریں تو حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوں گے۔ ریاستی وزیر نے کہا کہ آج طلائی تمغہ حاصل کرنے والوں میں حیدرآباد یا تلنگانہ سے زیادہ ایسے طلبہ و طالبات ہیں جن کا تعلق رائلسیما اور آندھرا پردیش کے ان علاقوں سے ہے جہاں تلگو کا بول بالا ہے۔ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ کڑپہ، وجے واڑہ، کنٹور اور کرنول کے بچے اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرتے ہوئے طلائی تمغہ پاسکتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو کسی کے دبانے یا دشمنی کی وجہ سے ختم نہیں ہوسکتی۔ صدر اردو اکادمی جدہ جمال قادری اور منیجنگ ٹرسٹی خاک طیبہ ٹرسٹ جناب غلام یزدانی ایڈوکیٹ نے اپنے اپنے اداروں کا تعارف پیش کیا۔ بعد ازاں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں منور رانا، معراج فیض آبادی، ایس انصاری، شبینہ ادیب، حسن کاظمی، الطاف ضیا، ریکھا شرما، نعیم اختر برہانپوری، جوہر کانپوری کے علاوہ مقامی شعرا حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ، رؤف رحیم، پروفیسر غیاث متین، آغا سروش، تسنیم جوہر اور بصیر افضل نے حصہ لیا۔

(سیاست، حیدرآباد)

اساتذہ کا تربیتی کیمپ

+ لکھنؤ، 19 رجولائی۔ اترپردیش فلاح عام سوسائٹی، لکھنؤ کی نگرانی میں ہر سال گرمی کی چھٹی میں ایک ماہ کے لیے اساتذہ کا تربیتی کیمپ منعقد کیا جاتا ہے۔ اس سال 16 رجون تا 15 رجولائی یہ کیمپ جامعۃ الصالحات رام پور میں منعقد ہوا۔ آفس سکریٹری ڈاکٹر محمد اکرم اس کیمپ کے نگراں تھے۔ اس تربیتی کیمپ میں 102 اساتذہ نے شرکت کی۔ ان میں خواتین کی تعداد 85 تھی۔ ابتدائی 19 ایام میں ماہرین تعلیم نے مختلف مضامین پر خطبے دیے، باقی ایام میں عملی تدریس کا اہتمام کیا گیا اور آخری تین دنوں میں ٹسٹ ہوئے۔ توقیر احمد نیو ماڈرن اسکول، دہلی، حبیب اکرم کانپور، محمد صادق عثمانی بلیا، ڈاکٹر فرحت حسین پرنسپل ڈگری کالج سودہا ہمیر پور، مہرالدین ماہر خصوصی ایس سی ای آر ٹی، دہلی، عبدالوحید، محمد فیض احمد لیکچرر شبلی بی ایڈ کالج اعظم گڑھ، محمد اشفاق احمد سکریٹری تعلیمات جماعت اسلامی ہند، اظہر بیگ، فتح پور اور جاوید اقبال سابق ناظم درسگاہ رام پور نے خطبے پیش کیے۔

اس کیمپ میں محترمہ بلقیس بیگم، محترمہ کوثر اسما، محترمہ عذرا جبیں، محترمہ نسیم آرا، محترمہ قیصر جہاں، محترمہ مجیب بیگم، اختر باجی اور صنوبر ناز جیلانی نے مشقی اسباق کے مشاہدہ کے فرائض انجام دیے۔

کیمپ کا اختتامی اجلاس زیر صدارت محمد احمد صدر اترپردیش فلاح عام سوسائٹی منعقد ہوا۔ ڈاکٹر محمد اکرم نے سوسائٹی کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد شرکائے کیمپ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب سلیم الباری نائب ناظم جامعہ، جناب محمد اسلم ناظم مرکزی درسگاہ، ڈائرکٹر کیمپ اظہر بیگ نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔

جناب محمد احمد نے اس موقعے پر کہا کہ اس طرح کے کیمپوں کو کامیاب اور موثر بنانے کا بڑی حد تک انحصار اس پر ہے کہ اس کی اچھی طرح منصوبہ بندی ہو۔ ماہرین تعلیم کی تلاش اور انتخاب ہو اور موزوں وقت کا تعین ہو۔ سوسائٹی یہ کیمپ اس لیے بھی لگاتی ہے کہ دیگر حضرات بھی اس جانب متوجہ ہو کر اس طرح کے کیمپ مختلف مقامات پر لگائیں۔ یہ کوششیں اگر جاری رہیں تو ہمارے تعلیمی اداروں سے ایسے طلبہ نکلیں گے جو ملت کے اندر دینی شعور و احساس بیدار کریں گے۔

(ڈاک سے)

مغربی بنگال اردو اکادمی کے انعامات

+ کلکتہ، 4 رجولائی۔ مغربی بنگال اردو اکادمی نے 2002 کی مطبوعہ اردو کتابوں پر مندرجۂ ذیل انعامات کا اعلان کیا ہے۔

(الف) مبلغ تین ہزار روپے کے انعامات: 1. سخن سراب از شہپر رسول (تخلیقی ادب) 2. جذبی شناسی از مشتاق صدف (تنقید) 3. اور پھر بیاں اپنا از منظر شہاب (تحقیق و تنقید) 4. دس رنگی تماشے۔ از اقبال نیازی (ادب اطفال)

مغربی بنگال کی سطح پر اردو کتابوں پر انعامات:

(الف) مبلغ پانچ ہزار روپے کے انعامات:

1. موقف از ف.س. اعجاز، 2. اذہان و اشخاص از دبیر احمد

(ب) مبلغ تین ہزار روپے کے انعامات:

1. دھوپ دھوپ سفر (علقمہ شبلی) 2. محمد سالم شخص اور عکس (ابوذر ہاشمی)

(ج) مبلغ دو ہزار روپے کے انعامات:

1. میراث غزل از ناظم سلطان پوری 2. کمپیوٹر کی بنیادی باتیں از سید خالد معراج 3. برف میں چنگاری از ڈاکٹر عشرت بیتاب 4. تمنا کا دوسرا قدم از قاصر کرم پوری 5. ذرا انتظار کر از فراغ روہوی

2002 میں معیاری، علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت پر ناشرین کو انعامات:

(الف) مبلغ دو ہزار روپے کا انعام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

(ب) مبلغ ایک ہزار روپے کے انعامات (برائے نفیس طباعت)

1. جناب ابوذر ہاشمی (ناشر) محمد سالم شخص اور عکس

2. جناب قاصر کرم پوری (ناشر) تمنا کا دوسرا قدم۔ (ڈاک سے)

مقابلۂ افسانہ نویسی

+ لکھنؤ، 18 رجولائی۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن (شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی) کے مقابلۂ افسانہ نویسی کے انعامات کی تقسیم کے سلسلے میں ہوٹل میزبان میں ہونے والی تقریب کی صدارت اترپردیش اردو اکادمی کے صدر

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کی۔ جلسے میں معروف افسانہ نگار عابد سہیل، اردو ہندی ساہتیہ اکادمی کے صدر اطہر نبی ایڈوکیٹ، ایسوسی ایشن کے صدر ڈاکٹر حمایت جائسی، جنرل سکریٹری ڈاکٹر منصور حسن خاں، سرپرست محسن خاں، ہیلپ لائن اینڈ کمپنی کے منیجنگ ڈائرکٹر ریحان فاروقی، خلیل احسن اور شکیل گیاوی نے بھی اظہار خیال کیا۔ شام غزل کے تحت ششا تک سنگھ اور عظمیٰ ارشد نے غزلیں پیش کیں۔ پروگرام کی نظامت افسانہ نویس ارشاد الٰہی نے کی۔

تقریب میں گروپ ''اے'' کا اول انعام منیرہ خاتون گروپ ''بی'' کا صبیحہ انصاری اور گروپ ''سی'' کا طاہرہ رضا کو ملا۔ انھیں شیلڈ اور 500 روپے دیے گئے۔ گروپ اے کا دوم انعام مہ جبیں، گروپ بی کا اقبال حیدر اور گروپ سی میں روبینہ پروین نے حاصل کیا۔ انھیں شیلڈ اور 300 روپے دیے گئے جبکہ گروپ اے کا سوم انعام یمنہ خاں، گروپ بی کا محمد شاہد کمال اور گروپ سی کا شبانہ رضوی نے حاصل کیا۔ انھیں شیلڈ اور 200 روپے پیش کیے گئے۔ اس کے علاوہ شبانہ منصوری، اقرا فاطمہ، تازیہ انصاری، عروج فاطمہ خاں یشودا، صغیرۃ الزہرا، نوید انجم اور سعید الرحمٰن کو تشجیعی انعامات دیے گئے جس میں شیلڈ اور 100 روپے شامل تھے۔

پروگرام کے آخر میں ایسوسی ایشن کے سوونیر اور گلدستۂ افسانہ کا اجرا عابد سہیل اور ملک زادہ منظور احمد نے کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

نوح ناروی پر مذاکرہ

+ الٰہ آباد، 15 رجولائی۔ ادبی وثقافتی تنظیم ''قلم کار'' کی طرف سے ایک ادبی نشست منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر عزیز بانو نے نوح ناروی حیات اور شاعری پر مقالہ پیش کیا۔ اس نشست کی صدارت شیروانی انٹر کالج صلاح پور (الٰہ آباد) کے سابق پرنسپل ڈاکٹر فخر الکریم اور نظامت عبد القیوم شمسی نے کی۔

نشست میں مقررین نے کہا کہ نوح ناروی بڑے رکھ رکھاؤ والے انسان تھے۔ ادبی حلقوں میں ان کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ نوح ناروی کی شاعری کی چند خصوصیات میں سب سے پہلی چیز زبان کی روانی ہے۔ ثقیل الفاظ اور فارسی ترکیبوں سے انھوں نے بڑی حد تک گریز کیا ہے۔ وہ حقیقت میں خالص زبان کے شاعر تھے۔ ان پر داغ اسکول کی شاعری کا خاصا اثر ہے لیکن ان کا کلام عامیانہ پن سے پاک ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں محاوروں کا برمحل استعمال کیا ہے۔ افضل جائسی نے نوح ناروی کے کچھ چنندہ اشعار پیش کیے۔

نشست میں جن افراد نے حصہ لیا ان میں خاص طور پر تنویر، جاوید نظر، ڈاکٹر نغمہ پروین، حسین جیلانی کے نام شامل ہیں۔ نشست کے آخر میں ممتاز دانشور اور اسکالر ڈاکٹر رفیق زکریا کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا اور شرکا نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو ریفریشر کورس

+ نئی دہلی، 21 رجولائی۔ ''اس ریفریشر کورس کا موضوع اردو غزل: آغاز تا امروز ہے، اس لیے ہمیں غزل کے عمومی میلانات اور رجحانات کے ساتھ ساتھ موضوعاتی سطح پر غزل کی تبدیلیوں کی نشاندہی کرنی پڑے گی۔'' ان خیالات کا اظہار معروف شاعر پروفیسر شہریار نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اکیڈمک اسٹاف کالج کی طرف سے گیارھویں اردو ریفریشر کورس کے افتتاحی اجلاس میں کیا۔ اس موقعے پر مہاتما گاندھی انٹرنیشنل ہندی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اشوک باجپئی نے کہا کہ ہمارے سماج میں مادری زبان کے تئیں اعتماد کم ہوتا جا رہا ہے۔ انھوں نے اساتذہ سے گذارش کی کہ وہ طلبہ میں مادری زبان کے تئیں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

جلسے کے آغاز میں پروفیسر اختر صدیقی نے شرکا کا استقبال کرتے ہوئے ہندوستان کی تعلیمی تاریخ سازی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رول پر روشنی ڈالی۔ کورس کو آرڈی نیٹر اور شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر خالد محمود نے کورس کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ غزل اور اس کے مختلف پہلوؤں پر لیکچر کے لیے جن اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئی ہیں، ان میں کمال احمد صدیقی، ظفر احمد صدیقی، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر قسیم حنفی، پروفیسر محمد ذاکر، پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، شاہد میر، ڈاکٹر شریف احمد، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، محمود ہاشمی، پروفیسر صغرا مہدی اور پروفیسر عتیق اللہ کے نام شامل ہیں۔ افتتاحی تقریب میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، پروفیسر ہمایوں ظفر زیدی، پروفیسر صغرا مہدی، پروفیسر شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر تسنیم فاطمہ، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر شہباز انجم، ڈاکٹر جی آر سید، ڈاکٹر شہزاد انجم اور ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی وغیرہ نے شرکت کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

سرکاری اردو مدارس میں داخلے کی اپیل

+ کڈپہ۔ انجمن ترقی اردو، ضلعی شاخ کڈپہ کی جانب سے بڈی ہائی اسکول کڈپہ میں صدر انجمن ترقی اردو کڈپہ سید شاہ مصطفےٰ حسین بخاری کے ہاتھوں سرکاری اردو مدارس میں داخلے کی اپیل سے متعلق پمفلیٹ کا اجرا عمل میں آیا۔ انھوں نے کہا کہ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے تو نہ صرف بچوں کی پوشیدہ صلاحیتیں ابھرتی ہیں بلکہ بچوں میں خود اعتمادی بھی پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے مستقبل کو روشن اور کامیاب بنا سکیں گے۔ آج اردو زبان کی ترقی بہت تیزی سے ہو رہی ہے اور یہ تصور غلط ثابت ہو چکا ہے کہ اردو پڑھنے سے ملازمتیں نہیں ملتیں۔ آج ہر موضوع اور ہر مضمون کی کتابیں اردو میں دستیاب ہیں۔

معتمد عمومی سید ہدایت اللہ نے کہا کہ اردو مدارس میں بہت سی سہولتیں میسر

ہیں۔ مفت داخلہ اور مفت تعلیم، ساتویں جماعت تک طلبہ وطالبات کو مفت بس پاس، پانچویں جماعت تک کے تمام لڑکوں اور آٹھویں جماعت تک کی تمام لڑکیوں کو مفت کتابوں کی فراہمی، معاشی اعتبار سے پسماندہ اور اچھے نمبرات حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کو وظیفے، ابتدائی درجات کے تمام طلبہ کو مفت دوپہر کا کھانا، اپر پرائمری اور ہائی اسکول کے طلبہ کو مفت کمپیوٹر تعلیم ماہر اور تجربہ کار اساتذہ کے ذریعے دی جارہی ہے۔

نائب صدر انجمن ترقی اردو شیخ عبدالستار فیضی نے کہا کہ اردو مدارس میں نہ صرف اردو بلکہ ہندی، تلگو اور انگریزی زبانیں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ شریک معتمد سید شکیل احمد شکیل نے اردو داں طبقے سے گذارش کی کہ اپنے بچوں کے روشن مستقبل کے لیے انھیں اردو مدارس میں داخل کرائیں۔ اردو مدارس کے قیام اور ترقی (Upgradation) کے لیے انجمن ترقی اردو ضلعی شاخ، 13/386، چاند پھرا گنبد، رحمت اللہ اسٹریٹ، کڈپہ سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ اس اجلاس میں سید مخدوم، سید فیاض الدین احمد، محمد ایوب، سید رحمت اللہ، یوسف وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ (ڈاک سے)

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کمپیوٹر سینٹر کا افتتاح

+ نئی دہلی، 18 رجولائی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جواہر لال نہرو اسٹڈیز سینٹر کی جانب سے نیلسن منڈیلا ہاؤس میں کمپیوٹر ایپلی کیشنز اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی سینٹر کا افتتاح وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اسے فروغ انسانی وسائل کی وزارت کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے قائم کیا گیا ہے، جس کا مقصد اردو طلبہ کو کمپیوٹر کے مختلف کورسوں سے واقف کرانا ہے۔ افتتاح کے موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اور پروفیسر اے آر رضوی کے علاوہ جامعہ کے اساتذہ، طلبہ اور دیگر حضرات کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

منتشرات

+ سرینگر، 28 رجون۔ شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے شاعر ڈاکٹر حنیف ترین کی آمد پر ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر قدوس جاوید نے اور نظامت فرید پربتی نے انجام دی۔ اس موقعے پر استاد شعبۂ اردو الطاف انجم نے کہا کہ اس وقت مظلوموں کے درد وکرب کی ترجمانی اگر کوئی فنکار صحیح ڈھنگ سے کر رہا ہے تو وہ حنیف ترین ہیں۔ سلیم سالک نے کہا کہ ڈاکٹر حنیف ترین نے اپنی شاعری میں بین الاقوامی واردات وسانحات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ جلسے میں محترمہ شبینہ پروین، ڈاکٹر شفق سوپوری، ڈاکٹر شگفتہ پروین اور ڈاکٹر رؤف راحت نے بھی حنیف ترین کی شاعری پر گفتگو کی۔

فرید پربتی نے حنیف ترین کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے لب ولہجے، زبان وبیان اور تخلیقی برتاؤ کی بنیاد پر جانے جاتے ہیں۔ ان کی نظر بین الاقوامی حالات وواقعات پر ہے۔ حنیف ترین کی شاعری میں احتجاج ایک لہر بن کر ابھرتا ہے۔ اس تقریب میں پروفیسر نذیر ملک، پروفیسر مجید مضمر، ڈاکٹر محبوبہ وانی، ڈاکٹر ظفر حیدر (ابن اکبر حیدر کشمیری) وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ آخر میں مہمان شاعر ڈاکٹر حنیف ترین نے اپنا کلام پیش کیا۔ (ڈاک سے)

+ چینئی، 12 رجون۔ دکنی کوٹہ، ضلع کرشنا گری، تملناڈو میں مسلم ایجوکیشن اینڈ ڈیولپمنٹ ٹرسٹ کی طرف سے اردو کانفرنس کا انعقاد ہوا جس کی صدارت جناب النصر نے کی اور افتتاح ڈاکٹر سید سجاد حسین، صدر شعبۂ اردو، مدراس یونیورسٹی نے کیا۔ اس اجلاس میں جناب امتیاز علی تاج، ڈپٹی ڈائرکٹر، دوردرشن، چینئی بطور مہمان خصوصی شامل ہوئے۔ دیگر مدعوئین میں تملناڈو گورنمنٹ اردو اکادمی کے سکریٹری اور رجسٹرار جناب کے. ایم. اشفاق الرحمٰن، جناب مختار بدری، جناب کے. ملک العزیز ممبران اردو اکادمی، جناب وی. محمد باشاہ، صدر تملناڈو اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن، جناب غوث شریف، سکریٹری، دکنی کوٹہ مسلم ایجوکیشن اینڈ ڈیولپمنٹ ٹرسٹ بھی شامل رہے۔

اس سال اردو میڈیم اسکول، دکنی کوٹہ سے دو طالبات نے ساجیات میں پورے ریاست میں پہلا اور دوسرا مقام حاصل کیا۔ جلسے میں ان لڑکیوں کو توصیف نامہ اور انعام دیا گیا۔ (ڈاک سے)

+ جمشید پور، 20 رجولائی۔ پروفیسر سید احمد شمیم کی رہائش گاہ پر انجمن ترقی اردو (ہند) مشرقی سنگھ بھوم، جمشید پور کی جانب سے ڈاکٹر رفیق زکریا کے ارتحال پر ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت جناب اسلم بدر نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر منظر شہاب، حفیظ بے تاب، ناصر راہی، جمیل مظہر، نذیر احمد، انور ادیب کے علاوہ مقامی دانشوروں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ پروفیسر سید احمد شمیم نے ڈاکٹر رفیق زکریا کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے مرحوم کو کلاسیکی اور جدید دانشوری کا مثالی استعارہ قرار دیا اور انھیں اسلامی تاریخ اور موجودہ عالمی معاشی اور سیاسی حالات کا نبض شناس قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ایسے وقت میں جب کہ ہمارا ملک سخت سیاسی بحران اور معاشرتی کشاکش سے گذر رہا ہے، رفیق زکریا کی موت ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ جلسے میں انور ادیب، اسلم شمس فریدی اور حفیظ بیتاب نے بھی رفیق زکریا کی خدمات پر روشنی ڈالی۔

(ڈاک سے)

+ کڈپہ، 23 رجون۔ آستانۂ مخدوم الٰہی پیروڈ، کڈپہ کے عرس کے موقعے پر ایک کل ہند نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت مشہور موسیقار جناب اے. آر. رحمٰن نے کی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ کل ہند مشاعرہ اپنی نوعیت کا واحد مشاعرہ ہے، جس کی بنیاد ایک صوفی بزرگ حضرت خواجہ سید شاہ امین اللہ محمد

محمد الحسینی نے ڈالی تھی۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی ریاضت و مجاہدے میں صرف کی۔ قومی یکجہتی کے فروغ میں ان بزرگوں کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔

سجادہ نشیں خواجہ سید شاہ عارف اللہ محمد محمود الحسینی کے خطاب کے بعد مشاعرہ شروع ہوا جس کی نظامت اسلم فرشوری نے کی۔ مشاعرے میں ڈاکٹر ساغر جنیدی، منور، انور شاہ ولی خاں، ن۔م۔ جالب، استاد فیضی، سید شکیل محمد شکیل، جوش ہاشم، ساقی نثار، عارف انیس، جانی امتیاز، خالد انور، ڈاکٹر شمس الدین ہاشمی، طیب پاشاہ، ابراہیم خاں ایاز، ثاقب، ساقی امام اور ممتاز راشد وغیرہ شریک ہوئے۔

(ڈاک سے)

+ دربھنگہ، 2 رجولائی۔ عبدالعلیم آسی کے دولت کدے پر ایک شعری نشست حسن امام درد کی صدارت میں منعقد کی گئی جس کی نظامت ادبی چوپال کے صدر عبدالودود قاسمی نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے مولانا عبدالعلیم آسی کی شاعرانہ عظمت اور سیاسی بصیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مولانا عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔ مولانا آسی کے بھی صاحبزادے امریکہ میں مقیم ہیں۔ گذشتہ دنوں مولانا آسی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے جاوید صدیقی دربھنگہ آئے تو ان کے اعزاز میں ایک ادبی محفل منعقد ہوئی جس میں منصور خوشتر، منظر الحق، منظر صدیقی، عبدالودود قاسمی، محمد فاروق اعظم انصاری، نسیم اختر بردا ہوی، ڈاکٹر شاکر خلیق، جنید عالم آروی، رہبر چندن پٹوی، ڈاکٹر عبدالمنان طرزی اور حسن امام درد نے کلام پیش کیا۔ (ڈاک سے)

+ پانی پت۔ آل انڈیا جیمنی اکادمی، پانی پت نے راشٹر کوی پدم شری سوہن لال دویدی کی پیدائش کے سو سال پورے ہونے کے موقعے پر اردو ہندی کے معروف قلم کار ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں ''ہندی سیوی سمان'' دینے کا اعلان کیا ہے۔ ڈاکٹر ہرگانوی کی ابھی تک اردو، ہندی اور انگریزی میں 94 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ رسالہ ''کوہسار جرنل'' کے مدیر ہیں اور بھاگلپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر ہیں۔

(ڈاک سے)

+ سیتاپور، 22 رجون۔ ادبی تنظیم بزم اردو، سیتاپور کی طرف سے ایک نعتیہ شعری نشست نوجوان شاعر اور افسانہ نگار عارف اثاروی کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی جس کی صدارت مست حفیظ رحمانی اور نظامت بدر سیتاپوری نے کی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی صبا بارہ بنکوی تھے۔ اس نشست میں جناب مست حفیظ رحمانی، صبا بارہ بنکوی، رضوان خاں، منظر یٰسین، بدر سیتاپوری، محفوظ سیتاپوری، عارف اثاروی، عمران سیتاپوری، شکیل ملانوی، سلیم اختر نے اپنا کلام پیش کیا۔ (ڈاک سے)

+ ورنگل، 19 رجولائی۔ محمد سرور علی افسر کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''تنقیدی کرنیں'' کا اجرا 14 رجولائی کو اسلامک انفارمیشن سینٹر میں بدست جناب محمد الیاس رضوی کنزرویٹر محکمۂ جنگلات، ورنگل ہوا۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

+ نئی دہلی، 25 رجولائی۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر اور 1857 کے شہیدوں کی یاد میں ایوان غالب میں گذشتہ شب انڈین کلچرل سوسائٹی کی طرف سے کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت سابق وزیر داخلہ یوپی سید ظفر علی نقوی نے کی جب کہ نظامت مرزا محمد عارف نے کی۔ مشاعرے میں ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر شفیق الرحمن برق سنبھلی، ساگر گروپ کے چیئرمین جی ساگر سوری، ٹھاکر ابھے پرتاپ سنگھ اور جاوید اختر پاشا بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ اس موقعے پر سوسائٹی کی جانب سے اے ایس جسر کو'' قومی ایکتا ایوارڈ برائے فروغ تعلیم'' اور ایڈووکیٹ محمد اکرام کو ''بہترین قانون داں'' کے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ سوسائٹی کے چیئرمین کے ایل نارنگ ساقی اور کنوینر میکش امروہوی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

شفیق الرحمن برق سنبھلی نے آزادی کی تحریک میں اردو زبان کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اردو کے فروغ کے لیے مسلسل جدوجہد کرنے پر زور دیا۔ قبل ازیں افتتاحی کلمات میں جی ساگر سوری نے مشاعروں کو نہ صرف اردو کے فروغ بلکہ آپسی بھائی چارے کا اہم ذریعہ قرار دیا۔

مشاعرے میں گلزار دہلوی، منور رانا، ساغر خیامی، طاہر فراز، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، افضل منگلوری، عقیل نعمانی، خورشید حیدر، حسن کاظمی، ریحانہ شاہین، ڈاکٹر شفاعت فہیم، اشوک ساحل، دلشاد نگینوی، ریکھا شرما، ایشا ناز، جاوید اعظمی، ڈاکٹر شفیق الرحمن برق سنبھلی، میکش امروہوی اور آصف نظر نے اپنی شعری تخلیقات پیش کیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

+ کڈپہ۔ انجمن ترقی اردو ضلعی شاخ، کڈپہ، ادبی مجلس کی طرف سے مرحوم قادر باشاہ برق کڈپوی کشمیری کی یاد میں 17 رجولائی کو رحمٰن اللہ اسٹریٹ میلاد گھر، کڈپہ میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ مہمانوں کا تعارف اور استقبال شریک معتمد، انجمن ترقی اردو کڈپہ سید شکیل احمد شکیل نے کرایا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے کہا کہ برق کڈپوی عوامی شاعر تھے۔ ان کی سادگی ان کی پہچان تھی۔ اس موقعے پر سید شکیل احمد شکیل کی پیش کش برق کڈپوی کی آواز میں نعتوں اور غزلوں پر مشتمل آڈیو کیسٹ ''گونج'' کا اجرا عمل میں آیا۔

صدر جلسہ مولانا سید شاہ مصطفےٰ حسین بخاری صدر انجمن ترقی اردو کڈپہ اور چیئرمین مدینہ انجینئرنگ کالج کڈپہ نے کہا کہ ادیب اور شاعر تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر ہوتا ہے اور شعر و ادب کے ذریعے اخلاقی اقدار اور صحت مند روایات کی تشہیر کرتا ہے۔ اس معیار پر برق مرحوم پورے اترتے ہیں۔

مہمان خصوصی پروفیسر انوراللہ انور، معتمد عمومی تنظیم مسلم دانشوران، کڈپہ تھے۔ مہمان اعزازی جناب رحمت اللہ مدیر" ساہتیہ بھرم" کڈپہ تھے۔ جلسے میں این وجیہ سارتھی، اسٹیشن ڈائرکٹر، آل انڈیا ریڈیو کڈپہ، راجہ رتنم ایزاک، سنگھ مترا، سراج الدین نے بھی تقاریر کیں۔ بعد ازیں تعزیتی مشاعرہ میں سلیمان اطہر جاوید (حیدرآباد) نثار احمد نثار، محمد امنی، عارف امنی، سوز، قاسم ساقی ہاشم، یاور، شاہ ولی خان میکانک، شکیل احمد، گوہر، سعید خاں، امیر نے کلام پیش کیا۔ مشاعرے کی نظامت جناب سید شکیل احمد شکیل نے کی۔ (ڈاک سے)

رسم اجرا

حیدرآباد میں غیر مسلموں کی ادبی خدمات

+ حیدرآباد، 23/اپریل۔ سید بشیر احمد کی تحقیقی کتاب" حیدرآباد میں غیر مسلموں کی ادبی خدمات (آزادی کے بعد)" کے اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے وزیر ٹرانسپورٹ ایس سنتوش ریڈی نے کہا کہ اس کے مطالعے سے حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ تقریب اردو ہال حمایت نگر میں منعقد ہوئی تھی۔ ابتدا میں ڈاکٹر سی نارائن ریڈی نے کتاب کی رسم اجرا انجام دی۔ جلسے کا آغاز ڈاکٹر مجید بیدار کے افتتاحی کلمات سے ہوا۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے کہا کہ بشیر احمد نے اس مقالے کے ذریعے دکن کی ملی جلی تہذیب پر کام کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔ مولانا اعجاز فرخ نے کہا کہ اس مقالے سے صرف غیر مسلم شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں کا احاطہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس عہد میں غیر مسلموں نے مسلم اقلیت کی جس طرح تائید اور حمایت کی اس کا پتہ بھی چلتا ہے۔ جناب رحمٰن جامی نے تہنیتی رباعی پیش کی۔ ڈاکٹر اودھیش بادوا اور پروفیسر بیگ احساس نے بھی کتاب سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جلسے کی نظامت قدیر انصاری نے کی۔ (ڈاک سے)

رتوں کا مسکن

+ جودھپور، 9/جولائی۔" خوشتر نے دنیا سے جڑ کر شعر کہے اور لفظوں کو نگینے کی طرح استعمال کیا ہے۔ ٹکرانے کے پتھر اگر الفاظ ہیں تو ان کا انسلاک تاج محل ہے۔ ٹھیک ویسے ہی خوشتر مکرانوی کا لباس سنگ مرمر اور ان کی شاعری شاہ جہاں کے سینے میں چھپی محبت ہے۔" ان خیالات کا اظہار معروف شاعر اور نقاد شین کاف نظام نے بزم اردو، جودھپور کی طرف سے بزرگ شاعر خوشتر مکرانوی کے تازہ شعری مجموعے" رتوں کا مسکن" کے اجرا کے موقعے پر کیا۔ اس موقعے پر خوشتر مکرانوی نے تازہ غزلوں کے اشعار بھی سنائے۔

رسم اجرا کے بعد ایک ادبی مذاکرے کا انعقاد ہوا جس میں" رتوں کا مسکن ــــ ایک تبصرہ" عنوان سے مقالہ پڑھتے ہوئے ڈاکٹر فرید آفریدی نے کہا کہ خوشتر مکرانوی نے اپنے تجربوں کو عام انسان تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ " خوشترانہ انداز بیاں" کے زیر عنوان اپنے مقالے میں رند مکرانوی نے کہا کہ انھوں نے شعر میں الفاظ کو پردہ داری کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ بزم کے سکریٹری ڈاکٹر نثار راہی نے" خوشتر مکرانوی ــــ خوابوں کی زنجیروں کا شاعر" کے عنوان سے مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ خوشتر لفظوں کے ذریعے روح کی آواز سننے کی کوشش کرتے ہیں۔ برجیش عنبر، ڈاکٹر گمان سنگھ، راج پروہت اور عبدالوحید غلجی نے بھی خوشتر مکرانوی کی شاعری اور شخصیت پر روشنی ڈالی۔

آخر میں راجستھان اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین جناب اے ڈی راہی نے شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض شین میم حنیف نے انجام دیے۔

(ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

منزل لوہاٹھیری

+ بزرگ شاعر و ادیب جناب منزل لوہاٹھیری کا 17/جولائی کو بدایوں میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم دو ہفتے سے شدید علیل تھے۔ انھیں 17/جولائی کو ان کے آبائی قبرستان لوہاٹھیر میں دفن کیا گیا۔

منزل صاحب 12/جولائی 1931 کو لوہاٹھیر (ضلع بدایوں) میں پیدا ہوئے تھے۔ شاعری کا آغاز 1944 میں ہوا۔ 1953 میں اپنے زمانے کے معروف استاد ابر احسنی گنوری کی شاگردی اختیار کی۔ ان کی مطبوعہ تصنیفات و تخلیقات میں شہر نگاراں (تذکرہ، 1968) پانی اور پیاس (ناول، 1969) راشٹریہ جھنکار، آئینۂ غزل (1986) جہان ادب (تذکرہ، 1982) فردوس کائنات (1984)، بہار غزل (1986) حسن غزل (1996) ہیں" منزل نما" زیر طبع تھی کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ اس مجموعے میں رباعیات، دوہے، ہائیکو، ماہیے شامل ہیں۔ (ڈاک سے)

امجد علی فیض

+ گلبرگہ، 12/جولائی۔ انجمن ترقی اردو ہند، گلبرگہ کے عہدے داران نے نئی نسل کے نمائندہ مزاح نگار جناب امجد علی فیض کے سانحۂ ارتحال پر اپنے گہرے رنج و ملال کا اظہار کیا ہے۔ مرحوم نے نہایت قلیل عرصے میں طنز و مزاح کے میدان میں اپنی شناخت بنائی تھی۔ ملک کے معیاری رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ حال ہی میں ان کا مجموعۂ مضامین" جستہ برجستہ" شائع ہو کر اہل فن سے داد حاصل کر چکا ہے۔ (ڈاک سے)

تبصرہ و تعارف

اردو کی نثری داستانیں/ گیان چند جین

صفحات: 906، قیمت: -/276 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: شہاب ظفر اعظمی

پروفیسر گیان چند جین کی یہ تصنیف سب سے پہلے 1954 میں پاکستان سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کا زیر نظر ایڈیشن تیرہ ابواب اور ایک ضمیمے پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مصنف نے عہد قدیم میں داستان گوئی کے آغاز اور اقسام پر روشنی ڈالی ہے اور داستان کی تعریف انگریزی قصوں کہانیوں کے آئینے میں متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے باب میں اردو کے قدیم افسانوی ادب کے فن اور موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہے جس میں ناول اور افسانے سے قبل کے داستانی سرمائے پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ اس باب میں مصنف نے داستان کی ہیئت اور تشکیلی عناصر پر بھی بحث کی ہے۔ علاوہ ازیں کردار نگاری اور منظر نگاری پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کا تیسرا باب ''داستانوں کے فروغ و زوال کے اسباب'' پر مشتمل ہے۔ داستانوں کے فروغ میں گیان چند جین نے دکن کے مقابلے شمالی ہند کو اولیت دی ہے اور زوال کے ضمن میں چار وجوہات پر زور دیا گیا ہے۔ اول فوق الفطرت قصوں سے حقیقت کی طرف رجحان۔ دوم سرسید تحریک کا اثر، سوم قوم کی ذہنی و طبعی ترقی اور چہارم وقت کی کمی۔ چوتھا باب ''دکنی قصوں'' پر مشتمل ہے، جس میں سب رس اور دیگر داستانوں کا جائزہ شامل ہے۔ پانچواں باب ''شمالی ہند میں داستان نویسی کا جائزہ'' ہے اور فورٹ ولیم کالج کے قیام تک لکھی گئی داستانوں کے ذکر پر محیط ہے۔ اس میں ''نوطرز مرصع'' کو اٹھارھویں صدی کی سب سے اہم اردو داستان قرار دیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں فورٹ ولیم کالج کی داستانوں (خلیل خاں اشک سے انشا کے ''سلک گہر'' تک) پر تحقیقی و تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ ساتویں باب ''سنسکرت اور ہندی سے متاثر قصے فورٹ ولیم کالج کے دور میں'' کے تحت سنسکرت و ہندی سے ترجمہ شدہ یا متاثر قصوں مثلاً بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، شکنتلا اور ہتوپدیش وغیرہ پر تجزیاتی بحث کی گئی ہے۔ آٹھویں باب ''سرور کا عہد'' میں سرور کے پیش رو محمد بخش مہجور ان کے معاصرین میں ناصر علی اور جعفر علی شیون کی داستانوں کا ذکر شامل ہے۔ اس کے علاوہ مرزا رجب علی بیگ سرور کی داستان ''فسانۂ عجائب'' پر مدلل اور مفصل بحث کی گئی ہے۔ نواں باب ''اردو میں الف لیلیٰ'' ہے۔ اس تحقیقی مطالعے میں مصنف نے الف لیلیٰ کے مختلف نسخوں کے پیش نظر اس کی ادبی اہمیت و انفرادیت پر روشنی ڈالی ہے اور گیارھواں باب داستان امیر حمزہ کے تحقیق اور تنقیدی مطالعے پر مشتمل ہے جس میں اس داستان کی تہذیبی اور ادبی اہمیت پر روشنی ڈالنے کے علاوہ داستان امیر حمزہ کے نول کشوری ایڈیشن کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جس کی تحقیقی اور تنقیدی زاویۂ نگاہ سے بڑی اہمیت ہے۔ بارھواں باب ''بوستان خیال'' کی تاریخ و تحقیق پر مشتمل ہے جس میں بوستان خیال کو داستان امیر حمزہ کے مقابلے میں کمزور داستان قرار دیا گیا ہے۔

آخری باب میں مصنف نے داستانوں کی ادبی و تہذیبی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ''قصہ مہر افروز دلبر'' کو شمالی ہند کی سب سے قدیم داستان قرار دیا ہے۔

بعد ازاں آخر میں بطور ضمیمہ کم اہم حکایتوں اور داستانوں کی فہرست مع ضروری تفصیلات کے دی گئی ہے۔ بہ اعتبار مجموعی اس کتاب میں کم و بیش اردو کی تمام اہم نثری داستانوں کا مطالعہ شامل ہے۔ معتبر ماخذات و مراجع کی روشنی میں ٹھوس نتائج تک پہنچنے کے لیے معروضی نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اردو داستانوں کی تحقیق و تنقید کے اصول و ضوابط بھی پہلی بار عملی طور پر منظر عام پر آئے ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس کے ذریعے مصنف نے داستان کی تحقیق و تنقید کی راہیں متعین کیں۔

•

عوامی ذرائع ابلاغ: ترسیل اور تعمیر و ترقی/ دیویندر اسر

مترجم: شاہد پرویز

صفحات: 170، قیمت: -/75 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: مشتاق صدف

دیویندر اسر کی تصنیف "Communication Mass Media & Development" کا اردو ترجمہ ''عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی'' کے عنوان سے شاہد پرویز نے کیا ہے۔ اس کتاب کا ہندی ترجمہ مصنف نے tu ek?;e%leizs".kvkSjfodkl کے نام سے کیا ہے۔ لیکن مصنف نے اس میں کچھ ترمیم و تنسیخ کر کے ہندوستانی معاشرے کو وسعت بخشی ہے اور اس میں ایک نئے باب فلم، ادب، تہذیب و ثقافت کا اضافہ کیا ہے۔ مترجم نے انگریزی اور ہندی متن کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ مترجم نے ترجمے کے دوران

انگریزی اصطلاحات کے لیے قومی اردو کونسل کی فرہنگ اصطلاحات سے زیادہ مدد لی ہے اور طلبہ و طالبات کی ذہن سازی کے لیے متن میں موجود تمام اردو اصطلاحات کے انگریزی متبادل الفاظ کو قوسین میں جگہ دی ہے۔ شاہد پرویز نے زیر نظر کتاب کے ترجمے میں اپنی تمام صلاحیتوں کا جوہر دکھایا ہے اور بہت ہی خوب صورت انداز سے انگریزی کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

زیر نظر کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں "ترسیل و ابلاغ اور تعمیر و ترقی" کے عنوان کے تحت ترسیل و ابلاغ اور سماجی تبدیلی، ترقیاتی عمل، جدید کاری، تعمیری ترسیل و ابلاغ اور ٹیلی ویژن کے ساتھ تعلیمی ترسیل و ابلاغ اور تفریح و مشغلہ پر موجود مواد پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں "عوامی ذرائع ترسیل اور سماج" کے تحت عوامی ذرائع ترسیل پیغام اور سامعین، رویے اور سماجی اثرات، رائے عامہ، تعلیم اور تہذیب و ثقافت کے موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ تیسرے حصے میں ترسیل و ابلاغ کے اصول، ترسیل و ابلاغ کا عمل، ترویج و اشاعت کے نئے تصورات کی ترسیل، ترسیل و ابلاغ کی دو اقدامی رو اور غیر لفظی ترسیل و ابلاغ سے متعلق معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ چوتھے حصے میں "ادب سینما، تہذیب و ثقافت" کے تحت داستان: روایت اور ترسیل و ابلاغ، ادب اقدار اور پاپولر کلچر اور کمرشیل سینما اور سماجی ترسیل سے متعارف کرایا گیا ہے۔ یہ تمام موضوعات طلبہ کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ آج کے اطلاعاتی دور میں اس قسم کی کتابوں کا ترجمہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ قومی کونسل کے اشاعتی منصوبے میں اس کتاب کا ترجمہ ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مصنف اور مترجم دونوں ہی اس کتاب کی اشاعت کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

•

آؤ سمندر کی سیر کریں / محمد شمس الحق

صفحات: 183، قیمت: -/22 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6 آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: مہتاب جہاں

قومی اردو کونسل نے ادب اطفال کی اشاعت پر خصوصی توجہ دی ہے۔ "آؤ سمندر کی سیر کریں" اسی سلسلے کی کڑی ہے جو بچوں کے لیے بہت مفید ہے۔ اس کے مطالعے سے بچوں کو سمندر سے متعلق کارآمد معلومات فراہم ہوں گی اور اس سمندری دنیا سے متعلق مزید دلچسپی پیدا ہوگی۔ یہ کتاب ایک مفصل تعارف اور اٹھارہ مختلف عنوانات مثلاً کرۂ آب، آؤ سمندر کی گہرائیوں میں چلیں، زیر آب پہاڑیاں، آئس برگ، سمندر کے خزانے، زیر آب میدانوں پر آتش فشاں، سمندر کے پانی کی حرکت، سمندر کی لہروں کے ذریعے ساحل پر خشکی کی مختلف شکلوں کا بننا، سمندر میں نمک، سمندر اور آب وہوا، سمندر بھی آلودہ ہوتے جا رہے ہیں، تین کھلے سمندر، بحرالکاہل کے جزیرے، بحری راستے، سمندر کے یہ باسی، قدرت کا بیش بہا عطیہ، سمندر اور تفریح، پر مبنی ہے۔ کتاب کا ہر حصہ معلومات کا خزانہ ہے۔ مثال کے طور پر "آؤ سمندر کی گہرائیوں میں چلیں" ایک بہت ہی معلومات افزا موضوع ہے۔ جس میں بچوں کو گرافوں کے ذریعے بحر و بر کے نشیب و فراز اور سمندر کی گہرائیوں سے متعلق دلچسپ انداز میں واقف کرایا گیا ہے کہ پہاڑیاں سمندر کے اندر کس طرح وجود میں آتی ہیں اور ان کے بننے میں کون کون سی چیزیں معاون ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس کتاب کے مطالعے سے بحری راستوں جیسے شمالی اٹلانٹک کا راستہ، سویز نہر کا راستہ، کیپ آف گڈ ہوپ کا راستہ، شمالی پیسفک کا راستہ سے متعلق بھی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں اس سے قطع نظر سمندر کے باسی یعنی مچھلیوں سے متعلق بھی تفصیلات دی گئی ہیں۔ مثلاً وہیل مچھلی کو سمندر کا ہاتھی، شارک کو سمندر کا شیر اور ڈولفن جسے عام طور پر مچھلی ہی خیال کیا جاتا ہے مگر وہ نسلی اعتبار سے مچھلیوں سے مختلف ہے۔ اس کے علاوہ سمندری گھوڑا، اسٹار فش، سی ارچن، سن فش، سورڈ فش (تلوار نما مچھلی) تارپیڈو فش، والرس اور پنگوئن، بچوں کا پسندیدہ جانور سے متعلق تصویروں کی مدد کے ساتھ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

یہ کتاب سمندر سے متعلقہ ہر پہلو کو اجاگر کرتی ہے جن میں سمندری پودوں اور ماہی گیری کے خاص خطوں کا بھی ذکر شامل ہے۔

•

وش منتھن / غضنفر

صفحات: 120، قیمت: -/100 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 3108، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-110006

مبصر: فیروز عالم

غضنفر کا شمار موجودہ دور کے اہم ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ پانی، کینچلی، کہانی انکل، مم، دویہ بانی اور فسوں ہر ناول میں انھوں نے ایک نیا موضوع منتخب کیا ہے اور اس کے لیے ایک نیا اسلوب وضع کیا ہے۔ ان کے تمام ناول ہمارے عہد کے کسی نہ کسی اہم مسئلے سے روشناس کراتے ہیں۔ زیر تبصرہ ناول میں غضنفر نے فرقہ واریت کو موضوع بنایا ہے۔ یہ ہمارے ملک کا المیہ ہے کہ مٹھی بھر لوگ اپنے مفاد کے لیے سازشیں رچتے ہیں، فرقہ وارانہ فسادات کراتے ہیں اور لاکھوں لوگوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیتے ہیں۔ بے قصور افراد کی املاک لوٹ لی جاتی ہیں یا تباہ کردی جاتی ہیں اور ان کی بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں کی آبروریزی کی جاتی ہے۔

غضنفر نے "وش منتھن" میں وہ پوری صورت حال واضح کرنے کی کوشش کی

ہے جس میں فرقہ داریت کو بڑھاوا ملتا ہے۔ فرقہ پرست طاقتوں کو یہ گوارا نہیں کہ اس ملک کے عوام ایک ساتھ امن وسکون سے رہ سکیں۔ اس لیے وہ مختلف طریقوں سے ان میں نفرت پیدا کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار کامران ہے جس کے والد لڈن علی خاں ہندو پاک جنگ میں اپنا ایک پاؤں گنوا چکے ہیں۔ گاؤں میں سب کے دکھ درد میں شریک ہونا اور حتی الامکان سب کی مدد کرنا اس خاندان کا شیوہ ہے۔ اس کے باوجود گاؤں کے بعض فرقہ پرست افراد انھیں "باہری" کہہ کر ان کی تذلیل کرتے ہیں۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے انھیں قدم قدم پر پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، کہیں نوکریوں میں ان کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے تو کہیں انھیں ملک کا غدار کہا جاتا ہے۔ کامران اس صورت حال سے پریشان ہو جاتا ہے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے۔ وہ سوچتا ہے:

"یہ اپنے کو سمجھتے کیا ہیں؟ آخر ہم نے ان کا بگاڑا کیا ہے؟ کیوں یہ ہمیں آئے دن ذلیل کرتے رہتے ہیں؟ کیوں ہمیں اس ملک کا دشمن سمجھتے ہیں؟ کیوں ہمیں شک کی نظر سے دیکھتے ہیں؟" (ص-11)

"میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ ہم باہری نہیں ہیں۔ ہم بھی اسی دھرتی کی مٹی سے جنمے ہیں۔ اسی میں پہلے بڑھے ہیں۔۔۔۔۔ یہ مٹی ہمارے لیے ماں سے کم درجہ نہیں رکھتی۔" (ص-29)

اس مایوس کن صورت حال میں دینو (دنیش کمار شرما) جیسے نئی نسل کے لوگ امید کی کرن بن کر سامنے آتے ہیں جو انسان کو اس کے اعمال اور کردار کی بنیاد پر پسند یا ناپسند کرتے ہیں، ہندو یا مسلمان کے نام پر نہیں۔ دینو اپنے دادا اور دیگر ایسے تمام لوگوں کو قائل کرنے اور راہ راست پر لانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام ہوتا ہے۔ فرقہ پرستی کی سیاست کرنے والے افراد یہ بھولنے کے لیے تیار نہیں کہ مسلمان بادشاہوں نے ان کے مندر توڑے اور ہندو عورتوں سے زبردستی شادی کی۔ اس لیے وہ مسلمانوں سے بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے بے حد منصوبہ بند طریقے سے مسلمانوں کو قتل کرنے، ان کے گھروں کو آگ لگانے، قطع تعلق کرنے اور ان کی املاک تباہ کرنے پر عمل کیا جاتا ہے۔ فسادات کا یہ منظر:

"چمنی والی عمارت کا اندرونی حصہ
رنگ برنگ کے کپڑوں سے لپٹی آگ
مشینوں سے اٹھتے شعلے
سبز گنبد سے نکلتی ہوئی سرخ لپٹیں
نیزے پر ٹنگا ایک شیر خوار بچہ
معصوم جسم میں پیوست ہوتی ہوئی گولیاں
سنگریلی فرش پر بے حس وحرکت پڑی ایک عورت
عریاں جسم............ (ص-119)

غضنفر نے جذباتیت کے بجائے حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ انھوں نے غیر جانبدارانہ انداز میں ان تمام اسباب پر بھی نظر ڈالی ہے جو ہندو مسلم عوام میں منافرت پیدا کرتے ہیں۔ بہ اعتبار مجموعی یہ ناول اپنے موضوع اور پلاٹ سے پورا انصاف کرتا ہے جو کسی بھی ناول کی کامیابی کا پہلا زینہ ہے۔

•

احتساب: انور شیخ کی غزل کا تنقیدی وتقابلی مطالعہ

عشرت ظفر

صفحات: 224، قیمت: -/200 روپے

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9 گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-2

مبصر: ارشد علی خاں

یہ کتاب نو ابواب میں منقسم ہے اور ہر باب میں انور شیخ کی غزل کے کسی ایک پہلو پر گفتگو کی گئی ہے۔ 62 صفحے کے طویل دیباچے "صریر قلم نغمۂ سروش" میں عشرت ظفر نے انور شیخ کے دوسرے فنون میں دخل اور ان کی ایجادات شعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں انور شیخ کی غزل کے لسانی نظام سے بحث کی گئی ہے، دوسرے باب میں ان کے یہاں پائی جانے والی روحانیت وارضیت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ تیسرا باب علامت واستعارہ سے منسوب ہے اور چوتھے باب میں حواسی پیکروں کے طلسم تلاشے گئے ہیں۔ اگلے پانچ ابواب میں بالترتیب انور شیخ کی غزل میں صنف نازک کی سحر انگیزی، ادراک جمال، کلاسک سے رشتہ، عصری شعور کی گونج اور طنز ومزاح کی کھوج کی گئی ہے اور آخر میں مختصر طور پر "انور شیخ ایک نظر میں" اور "انور شیخ کا شعری نظریہ" پیش کر دیا گیا ہے۔

"انور شیخ ایک نظر میں" کے مطابق انور شیخ کے نانا اور دادا دونوں ہی کشمیر کے برہمن خاندانوں سے تھے۔ ان کے پردادا جو پیشے سے پروہت تھے، مشرف بہ اسلام ہوئے اور پنجاب آکر اسلامی علوم سے آراستہ ہو کر امام مسجد بن گئے۔ ننہیال اور ددھیال دونوں کا گھریلو ماحول پوری طرح اسلامی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان کی والدہ مرحومہ قرآن وحدیث سے اچھی طرح واقف تھیں اور ان کے نانا ایک نیک دین دار انسان تھے جو موصوف کے "انداز پیدائش سے بڑے متاثر ہوئے" تھے اور چونکہ انور شیخ بروز حج پیدا ہوئے تھے اس لیے انھوں نے ان کا نام حاجی محمد انور رکھا تھا۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مرتبہ نہیں ہے بلکہ طبع زاد ہے۔ مصنف کے اخذ کردہ نتائج سے اختلاف یا اتفاق تو کیا جا سکتا ہے جن میں بعد المشرقین نہیں ہے جو مرتب کردہ کتابوں کے مضامین میں عام طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کتاب کی بڑی خوبی، اس کی دیدہ زیب پیش کش ہے۔ کتاب اغلاط سے پاک تو نہیں لیکن ان کا تناسب بہت کم ہے۔

•••

مصنف: سکنف اور سکنف　　　"سائنس کی کہانیاں" (حصہ اول) سے اقتباس　　　بچوں کا گوشہ

مترجم: انیس الدین ملک

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انھیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ذیل میں "سائنس کی کہانیاں" سے ایک اقتباس پیش کیا جارہا ہے۔

بچے فطرتاً تجسس پسند ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آس پاس کی ہر شے کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ اس کتاب میں ایسے مختلف موضوعات پر تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ چند عنوانات درج ذیل ہیں۔ قلوپطرہ نے ایک موتی گھولا، راہب اور بارود، بارود اور ایک آتش فشاں پہاڑ، ایپسم نمک، اتفاقی رنگ، اولین غبارے، دھوئیں سے روشنی، پادری۔ سوڈاواٹر اور چوہے۔152 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 18روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصدکی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

کانچ بنانے کا فن

کانچ اگرچہ قدرتی طور سے پایا نہیں جاتا لیکن انسان اس کو تقریباً تین، چار ہزار سال سے استعمال کررہا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بہت پہلے اس کو ملک کانان (جس کا ذکر انجیل میں ہے) میں بنایا جاتا تھا جس کا تجارتی مرکز سِڈون شہر تھا۔

کانان جس کو رومن تاریخ داں پلنی نے فنوسیا کہا ہے، شام میں بحر روم کے کنارے ایک خوشحال ضلع تھا۔ اس علاقے کی سیرابی کا ذریعہ دریا بیلس تھا۔ اس دریا کا منبع کوہ کارمیل کے دلدلی علاقے میں ہے اور یہ تقریباً 5 میل بہتا ہوا سمندر میں مل جاتا ہے۔ دریا کے دہانے کے تقریباً آدھے میل تک اس کے ذریعے لائی ہوئی مٹی اور ریت جمع ہوجاتی ہے۔ سمندر سے آئے ہوئے جوار بھاٹے کا پانی ریت کو دھودیتا ہے جس سے ریت میں ملی بہت سی اشیا سمندر کے پانی کے ساتھ چلی جاتی ہیں اور چاندی جیسی ریت رہ جاتی ہے جو سورج کی روشنی میں چمکتی ہے۔ فنوسین کے لیے یہ تنگ ریتیلا علاقے کی دریافت شیشے کی غیر متوقع دریافت کا سبب بنی۔

فنوسین ایک محنتی نسل کے لوگ تھے۔ یہ لوگ بحری سفر کے ذریعے اس زمانے میں دریافت شدہ ممالک میں تجارت کی غرض سے جاتے اور خام اشیا کے بدلے تیار شدہ اشیا دیا کرتے تھے۔ یہ لوگ برطانیہ جاتے اور وہاں کپڑے کے بدلے کورنوال کی کانوں سے نکلے رانگے کو خریدتے تھے۔ یہ لوگ اکثر قریبی ملک مصر جایا کرتے تھے اور وہاں سے سوڈیم کاربونیٹ یعنی خام سوڈا لاتے جس میں تھوڑی مقدار میں سوڈیم بائی کاربونیٹ، کھانے کا نمک اور دوسری ملاوٹیں ہوتی تھیں۔ خام سوڈا مصر میں جھیلوں کے کنارے کثرت سے پایا جاتا تھا اور اس

کو کپڑے اور دوسری چیزوں کے دھونے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں صابن کی دریافت نہیں ہوئی تھی۔ مصری اس کو مرے ہوئے انسانوں کے جسم کو ممی کے طور پر محفوظ کرنے میں بھی استعمال کرتے تھے۔

پلنی نے کانچ کی اتفاقی دریافت کی کہانی بیان کی ہے۔ اس کے مطابق بیلس کے ساحل کے قریب تنگ علاقے میں جہاز راں خام سوڈے سے لدے جہاز اترے اور اپنا کھانا تیار کرنے لگے۔ اس ریتیلے ساحل پر جب انھیں اپنے برتن آگ پر رکھنے کے لیے کوئی پتھر نہ ملا تو یہ اپنے جہاز سے سوڈے کے بڑے بڑے ٹکڑے لے آئے۔ پھر انھوں نے اپنے برتن کے نیچے آگ جلائی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ایک نا معلوم شفاف رقیق مادے کو بہتے ہوئے دیکھ کر یہ لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ یہ رقیق سوڈے اور ریت پر گرمی کے عمل سے بنا تھا اور اصلیت میں یہ رقیق کانچ تھا۔

سوڈے اور ریت کو گرم کرکے کانچ بنانے کے اس اتفاقیہ طور سے دریافت ہوئے طریقے کو ہنرمند فنوسین نے فروغ دیا اور جلد ہی وہ کانچ سے مختلف اشیا بنانے لگے۔ شروع میں شاید انھوں نے شیشے کے رنگین دانے بنائے اور اسے دوسرے ملکوں کی کم ترقی یافتہ قوموں کے ہاتھوں کارآمد اشیا کے بدلے بیچا۔

کانچ بنانے کے اس طریقے کی دریافت کی اس کہانی کی موافقت یا مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن کہانی میں کانچ بنانے میں استعمال ہونے والے اجزا سوڈیم کاربونیٹ، ریت اور گرمی کا ذکر بلاشبہ صحیح ہے۔ بیلس کے قریب تنگ علاقے میں پائی جانے والی ریت شیشہ سازی کے لیے نہایت موزوں ہے اور اسے اس مقصد کے لیے سیکڑوں برس سے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن بہت سے مصنفین کو اس بارے میں شبہ ہے کہ سمندر کے کنارے لکڑی کو جلا کر حاصل کی ہوئی گرمی سے درجۂ حرارت اتنا کیسے پہنچا ہوگا جس نے ریت اور سوڈے کو پگھلا کر رقیق کانچ بنا دیا۔

رقیق کانچ بنانے کے لیے ضروری درجۂ حرارت ریت اور سوڈے کے تناسب پر منحصر ہے۔ حال ہی کے ایک تجربے نے یہ ثابت کیا ہے کہ لکڑی کو کھلی ہوا میں دو گھنٹے تک جلانے سے اتنی حرارت مل سکتی ہے جو کسی بھی ایسی آمیزش کو پگھلا سکتی ہے جس سے بیشتر کانچ بن سکتے ہیں۔ لیکن اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ فنوسین کو آگ جلانے سے اتنی ہی گرمی ملی تھی جتنی مذکورہ بالا تجربے میں دستیاب ہوئی۔

بہرکیف یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ فنوسین ملاحوں کو کم از کم اتنی گرمی ضرور حاصل ہوئی جس نے مخلوط کی سطح کو شیشے کی مانند چمکیلا بنا دیا۔ اس سے کسی بھی ذہین آدمی کو اس بات کا اشارہ مل سکا ہوگا کہ سوڈے اور ریت کو ایک خاص قسم کی بھٹی میں گرم کرنے پر ایک نئی چمکیلی اور دلکش شے حاصل کی جا سکتی ہے۔

مندرجۂ ذیل کہانی سے بہت شدید آگ سے کانچ بنانے کے طریقے کی دریافت کا پتہ چلتا ہے۔" کچھ لوگوں کے بیان کے

مطابق اسرائیلی بچوں نے ایک جنگل میں آگ لگا دی۔ آگ میں اتنی شدت تھی کہ اس کے تپش سے نائٹر اور سوڈا پگھل کر مل گئے اور لاوے کی طرح پہاڑیوں کی ڈھلان سے بہنے لگے۔ اس کے بعد سے لوگ مصنوعی طریقے سے کانچ بنانے لگے۔ جو پہلے اتفاقی طور سے بن گیا تھا۔" یہاں پر نائٹر سے مصنف کی مراد کسی کھاری شے سے ہے جو سوڈا یا اس سے ملتی جلتی کوئی شے ہوسکتی ہے۔

اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ فنوسین یا اسرائیلیوں نے یا دونوں نے اتفاقی طور سے کانچ بنانے کے طریقے کی دریافت کے بارے میں زیادہ شہادت نہیں ملتی ہے۔ تاہم یہ بات پوری طرح مسلم ہے کہ قدیم مصریوں کو ان دونوں قوموں سے بہت پہلے کانچ بنانے کا طریقہ معلوم تھا۔ کیونکہ قدیم مصریوں کے پاس شیشے کے ایسے سامان ملے ہیں جو فنوسین کے شیشے بنانے کی دریافت سے کئی سو سال پرانی ہیں۔

کچھ دانشوروں کی رائے میں جنھوں نے پرانی قوموں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، شیشے بنانے کا فن، روغنی کے برتنوں کے فن کے ساتھ ساتھ بتدریج وجود میں آیا کیونکہ مصری لوگ برتنوں پر جس شے کا ملمع کیا کرتے تھے وہ کیمیاوی طور سے شیشے کی مانند تھی۔ ان دانشوروں کا یہ بھی یقین ہے کہ یہ طریقہ مصر میں ایجاد ہوا اور وہاں سے بعد میں فونیسیا اور دوسرے ممالک میں آیا۔

کانچ کو کب اور کہاں سب سے پہلے تیار کیا گیا۔ یہ ایک بحث طلب موضوع ہے لیکن بلاشبہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں روم کے حکمراں شہنشاہ تبرس کے دور میں مصری کانچ بنانے کے فن میں لاثانی تھے۔ اس سے صدیوں پہلے بھی مصری بڑے پیمانے پر کانچ تیار کرتے تھے جو بیرونی ممالک میں فروخت کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا اور وہ اسے کافی گراں فروخت کیا کرتے تھے۔ تبرس نے مصری کاریگروں کو روم میں شیشے کے کارخانے قائم کرنے اور رومن کاریگروں کو اس کے بنانے کا فن سکھانے کے لیے آمادہ کیا۔ یہ مہم اتنی کامیاب رہی کہ شہنشاہ نیرو (65 عیسوی) کے زمانے میں رومن شیشے کے ظروف بنانے اور پچہ کاری میں مصریوں کے مقابل تھے۔ مثلاً نیرو نے کانچ کا ایک شراب کا جام بنوایا تھا جس کی قیمت سکۂ رائج الوقت میں تقریباً پچاس ہزار پونڈ (دس لاکھ روپے) تھی۔

ایک روایت کے مطابق تبرس کے دورِ حکومت میں ایک شخص نے ایک خاص قسم کا کانچ بنانے کا طریقہ دریافت کیا جو ضرب لگانے پر معمولی کانچ کی مانند کرچوں میں نہیں ٹوٹتا تھا بلکہ اس میں صرف نشان پڑ جاتے تھے۔ اس نے اس کانچ کا ایک خوبصورت پیالہ بنایا اور یہ سوچا کہ چونکہ تبرس کو کانچ بنانے کے فن سے کافی دلچسپی ہے اس لیے وہ بادشاہ کے حضور میں اسے تحفتاً پیش کرکے اس کی مہربانیوں سے فیضیاب ہوگا۔ لیکن جیسا کہ بہت سی پرانی کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس واقعہ کی بھی کئی روایتیں ہیں۔ ایک پرانے مصنف کے مطابق وہ آدمی ایک سابق معمار تھا اور اسے تبرس نے ملک بدر کردیا تھا۔ اس معمار نے اپنے دورِ جلاوطنی میں دریافت کیا کہ نہ ٹوٹنے والا یا لوچدار کانچ کیسے بنایا جاسکتا ہے اور اس نے اس دریافت کردہ کانچ کا ایک شراب پینے کا برتن بنایا۔ اب اسے یہ امید تھی کہ ایسا عمدہ اور بے نظیر تحفہ پاکر

تبرس نہ صرف اسے معاف کردے گا، جلاوطنی کا حکم واپس لے کر اسے انعام و اکرام سے بھی نوازے گا۔

مورخ پلنی نے بھی اس حیرت انگیز دریافت کی چند تفصیلات دی تھیں۔

''یہ روایت ہے کہ تبرس کے زمانے میں لچکدار کانچ بنانے کا طریقہ دریافت ہوا۔ لیکن اس قسم کے شیشے بنانے کے کارخانے مکمل طور سے تباہ کردیے گئے۔ کیونکہ اس سے تانبا، چاندی اور سونے کی وقعت گرنے کا خدشہ تھا۔ لیکن یہ کہانی ایک تصدیق شدہ واقعہ کے بجائے ایک لمبے عرصے تک محض افواہ بنی رہی۔''

ایک دوسرے مصنف کے زیادہ تفصیلی بیان کے مطابق:

''ایک رومن کاریگر نے نہ ٹوٹنے والے شیشے کا پیالہ بنانے کا طریقہ دریافت کیا اور اس خیال سے کہ پیالہ بادشاہ کو تحفتاً پیش کرنے پر اسے انعام و اکرام ملے گا، اس نے ایک پیالہ بادشاہ کو پیش کیا۔ اس پیالے کی بہت تعریف کی گئی کیونکہ یہ بادشاہ کے سونے کے پیالوں سے کہیں زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا اور اس سے قبل کہ بادشاہ اس کا قریب سے معائنہ کرتا، اس نے بادشاہ سے پیالہ چھین لیا اور زمین پر پٹخ دیا۔ بادشاہ اس کی اس حرکت سے چونکا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے کاریگر نے پیالہ اٹھالیا اور وہاں پر موجود لوگوں نے دیکھا کہ اس پر ایسے ہی نشان پڑ گئے ہیں جیسے کہ پیتل کے برتن پر پڑ جاتے ہیں۔ پھر کاریگر نے اپنی جیب سے ایک ہتھوڑی نکالی اور نشانوں پر ہلکی سی ضرب لگا کر پیالے کو درست کردیا۔ اپنی اس کارگزاری پر وہ آدمی بے انتہا خوش ہوا۔ اور پھر بادشاہ کے یہ پوچھنے پر کہ تمھارے سوا کانچ بنانے کے اس فن سے کوئی اور بھی واقف ہے؟ وہ یہ سمجھ بیٹھا جیسے اس نے جنت کی دولت پالی ہے اور نفی میں جواب دیا۔ اس پر تبرس نے حکم دیا کہ اس شخص کا سر کاٹ لیا جائے کیونکہ اس فن کے راز کے انکشاف ہونے پر ہم لوگ سونے کو خاک سے زیادہ اہمیت نہیں دیں گے۔''

اس سلسلے میں زیادہ تر واقعات ان لوگوں کے تحریر کردہ ہیں جو تبرس کے زمانے میں موجود تھے اس لیے ان روایتوں کو قطعی طور سے مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ نہ ٹوٹنے والا کانچ صدیوں تک بازاروں میں بکا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ شہنشاہ کو پیش کیا جانے والا پیالہ ایک بلوری ریزن کا بنا ہوا تھا جو کانچ کی مانند لگتا تھا لیکن بے لوچ نہیں تھا اور اس لیے ضرب پہنچنے پر ٹوٹتا نہیں تھا۔

پچھلے دو ہزار سال میں کئی بار نہ ٹوٹنے والے شیشے کی دریافت کے دعوے کیے گئے۔ ان میں سے ایک دعویٰ خاص حیثیت رکھتا ہے کیونکہ دریافت کنندہ کو تبرس کے دور حکومت کی طرح انعام نہیں مل سکا جس کی وہ امید کرتا تھا۔ یہ دریافت تیرھویں لوئی کے عہد میں ہوئی۔ موجد نے اس نئے شیشے کا ایک پتلا بنایا اور کارڈ نیل رچ، لوئی کو پیش کیا۔ کارڈ نیل اس زمانے کا سب سے زیادہ پر اثر سیاست داں تھا بلکہ درحقیقت وہی ملک کا اصلی حکمراں بھی تھا۔ کارڈ نیل نے بھی وہی کیا جو تبرس نے کیا تھا اور موجد کو انعام و اکرام کے بجائے عمر قید کی سزا ملی۔ کارڈ نیل کو خدشہ تھا کہ اگر نہ ٹوٹنے والے شیشے کا استعمال عام ہوگیا تو فرانس کے شیشہ سازوں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس لیے

اس نئے کانچ کے بنانے کا طریقہ اگر کبھی معلوم بھی تھا تو وہ خفیہ رہا اور منظر عام پر نہیں آیا۔

اوپر بیان کی گئی مشہور دریافتوں میں سے کسی سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ لیکن اس صدی کی ابتدا میں ایک دن ایک فرانسیسی سائنسداں ایڈورڈ بینڈکٹس ایک چشم دید واقعہ سے دوچار ہوا جس میں ایک عورت کار کے شیشوں کے اڑتے ہوئے ٹکڑوں سے شدید طور پر زخمی ہوئی۔ اس حادثے سے بینڈکٹس کے دماغ میں کئی سال پیشتر گزرے ہوئے سلولائڈ کے واقعے کی یاد آئی۔ اس زمانے میں سلولائڈ کثرت سے چاقو کے دستے، کنگھی، پیانوں کی چابی اور دوسری اشیا بنانے کے کام میں استعمال ہوتا تھا اور یہ ہاتھی کے دانت اور ہڈیوں کا ایک سستا بدل تھا۔ آج کل اس کے بجائے پلاسٹک کے سامان استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ الکحل اور دوسرے آسانی سے آبخرات میں تبدیل ہونے والے سیال ماڈوں میں گھل جاتا ہے۔

1885 عیسوی میں ایک تجربہ کے اختتام پر سلولائڈ کے محلول کو جو ایک بوتل میں موجود تھا، تجربہ گاہ کی ایک الماری کے اونچے تختے پر رکھ دیا گیا۔ یہ بوتل 1903 تک وہیں رہی۔ ایک دن جب بینڈکٹس تجربہ گاہ کی صفائی کر رہا تھا، صفائی کے دوران اس بوتل کو اٹھاتے وقت وہ اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور فرش پر چکنا چور ہوگیا۔ بینڈکٹس کو یہ امید تھی کہ اب اسے چاروں طرف ٹوٹے ہوئے شیشوں کے ٹکڑے اور ادھر ادھر پھیلی ہوئی کرچیں نظر آئیں گی۔ لیکن اس کے تعجب کی کوئی حد نہیں رہی جب اس نے دیکھا کہ اگرچہ بوتل ٹوٹ گئی تھی لیکن اس کے ٹکڑے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے گویا ایک لس دار شے سے جڑے ہوں۔

اس نے ٹوٹی ہوئی بوتل کو اٹھایا اور لیبل کو پڑھا جو آج سے پندرہ سال قبل لگایا گیا تھا۔ اس سے اسے پتہ چلا کہ بوتل میں سلولائڈ کا ایک محلول تھا۔ بینڈکٹس نے اندازہ لگایا کہ 15 سال میں محلول کا محلل پوری طرح اڑ گیا۔ اس لیے سلولائڈ کی ایک تہہ بوتل کی اندرونی دیوار پر جم گئی تھی۔ اس نے تجسس کی غرض سے اس شکستہ بوتل کو اپنے پاس رکھ لیا اور اس کے ساتھ ایک تحریر بھی لگا دی کہ اس شکستہ بوتل میں پہلے کیا تھا اور کیا واقعہ پیش آیا۔

جب بینڈکٹس نے کار کا حادثہ دیکھا تو اسے شکستہ بوتل کی یاد آئی۔ اس کے دماغ میں ایک نیا خیال پیدا ہوا اور وہ فوراً تجربہ گاہ میں واپس آگیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ساری رات وہاں رہا اور دن نکلنے تک اس کے دماغ میں حفاظتی شیشے کی چادریں بنانے کی ترکیب آگئی۔ اس کی ترکیب کے مطابق شیشے کی چادر کی ایک طرف سلولائڈ کے محلول کی تہہ بچھا دی گئی اور جب محلول کا بیشتر حصہ ابخرات کی شکل میں اڑ گیا تو سلولائڈ ایک لعاب کی شکل میں بچ گیا۔ اس پر ایک دوسری شیشے کی چادر رکھ کر دبا دیا گیا اور اسے اس وقت تک چھوڑ دیا گیا جب تک اس میں سختی نہ آجائے۔ اس طرح شیشے کی دونوں چادریں ایک دوسرے سے مضبوطی سے جڑ گئیں۔ جب اسے بینڈکٹس نے توڑا تو چادر کے ٹکڑے ادھر ادھر نہیں پھیلے بلکہ سلولائڈ کی فلم میں ہی چپکے رہے۔ اس طرح اس نے ایک نئی دریافت کی جس سے حادثوں میں اڑتے ہوئے شیشے کے

ٹکڑوں سے زخمی ہونے کا خطرہ کم ہوگیا۔

اس حفاظتی شیشے میں تین تہیں تھیں، دو شیشے کی اور ایک سلولائڈ کی۔ بینڈکٹس نے اس نئی ایجاد کردہ چیز کو ٹرپلکس کا نام دیا اور 1909 میں اس کو پیٹنٹ کرایا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ٹوٹی ہوئی بوتل نے بینڈکٹس کو ٹرپلکس بنانے کا خیال دیا لیکن وہ پہلا شخص نہیں تھا جس نے تین تہوں کے حفاظتی شیشے کو پیٹنٹ کرایا۔ 1906 میں ایک انگریز جان سی ووڈ کو بھی اسی قسم کا خیال آیا اور اس نے بینڈکٹس کے سلولائڈ کے بجائے کینڈا بالسم کا استعمال کیا۔ لیکن ووڈ کی ایجاد تجارتی طور پر زیادہ کامیاب نہیں رہی جبکہ بینڈکٹس کا حفاظتی گلاس تجارتی طور پر بہت زیادہ مقبول ہوا۔

1909 سے اب تک حفاظتی شیشہ بنانے کے طریقوں میں بہت سی اصلاحیں ہوئی ہیں۔ خاص طور سے نئی لیس دار اشیا اور خصوصاً نئے پلاسٹک نے سلولائڈ کی جگہ لے لی ہے۔

○○○

انیس کے مرثیے

مرتبہ: بیگم صالحہ عابد حسین

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن یہاں ان کے پورے کلام کا پہلا تنقیدی ایڈیشن ہے اور ان میں پہلی بار صحت متن کا بھی زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بیگم صالحہ عابد حسین نے تدوین کے جدید اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے دو جلدوں میں مرتب کی ہے جس میں انیس کے تمام دستیاب مرثیے شامل ہیں۔ ہر جلد کے ساتھ مفصل مقدمہ بھی ہے اور ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی جو اب کم مستعمل ہیں یا معنوی تغیر سے دوچار ہوئے ہیں۔

جلد اوّل، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 540، قیمت: -/36 روپے

جلد دوم، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 575، قیمت: -/40 روپے

کلیات فانی

مرتب: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

حسرت، اصغر، جگر اور فانی کو ان کی زندگی ہی میں غزل کے چار ستونوں کی حیثیت دے دی گئی تھی لیکن ان میں سے ہر شاعر کا انداز سخن جداگانہ ہے۔ فانی کی خصوصیت ان کی حزن پسندی ہے جس نے ان کے کلام میں ایک خاص اثر پیدا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے مرتبہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ فانی کی کہی ہوئی نظمیں، قصیدے، قطعات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ شروع میں مرتب نے فانی کی شخصیت اور شاعری پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 318، قیمت: -/63 روپے

کاشف الحقائق

مصنف: سید امداد امام اثر

سید امداد امام اثر کی یہ بلند پایہ تصنیف دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں یورپی ادبیات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں مشرقی ادبیات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔ شعر و ادب اور دیگر فنون لطیفہ میں جو باہمی قربت و وابستگی ہے، اس کا بھی ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں اردو شاعری کی تمام اصناف اور ہر صنف کے نمائندہ شاعروں کا تفصیلی بیان ہے جو تجزیاتی انداز کا حامل ہے۔ اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت پروفیسر وہاب اشرفی کا مبسوط مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 740، قیمت -/145 روپے

اڑیسہ میں اردو

مصنف: ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری

ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری کی یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اڑیسہ میں اردو کا تاریخی اور ثقافتی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا باب اڑیسہ میں اردو شاعری کے ارتقا اور تیسرا اردو نثر کے ارتقا کے بیان میں ہے۔ چوتھا باب دو فصلوں میں منقسم ہے: اڑیسہ کا اردو تاریخی ادب اور اردو رسالے اور اڑیسہ میں اردو صحافت۔ باب پنجم چار ذیلی عنوانات پر مبنی ہے: اڑیسہ میں عہد جدید میں اردو، اردو تعلیم کی صورت حال، اردو کے ادبی اور ثقافتی ادارے، اردو کی اشاعتی سرگرمیاں۔ چھٹا باب ماحصل مطالعہ کے عنوان سے ہے جس میں تمام مباحث کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر ایک جامع اور مستند کتاب۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 504، قیمت: -/157 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

''اردو ادب و تہذیب کے ارتقا میں پریم چند اور ان کے معاصرین کی خدمات'' کے زیر عنوان منعقدہ مذاکرے میں مقالہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر ابوالکلام قاسمی،
تصویر میں پروفیسر قمر رئیس، جناب رفعت سروش، ڈاکٹر خلیق انجم اور جناب شاکر خلیق کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

مذاکرے کی افتتاحی تقریب کے موقعے پر لی گئی سامعین کی ایک تصویر۔ پہلی قطار میں (دائیں سے) ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر شمیم حنفی، جناب مجتبیٰ حسین،
جناب اردن کول، جناب نامی انصاری، جناب اقبال مجید، محترمہ جیلانی بانو، پروفیسر شارب ردولوی۔

RNI NO. 70323/99

DL-15052/2003-5

URDU DUNIYA Monthly, September 2005, Vol. 7, Issue:9

Date of Publication 24/08/2005

National Council for Promotion of Urdu Language

Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi.

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

انیس کے سلام

مرتب: علی جواد زیدی

انیس کے سلاموں کا یہ پہلا جامع مجموعہ ہے جس میں انیس کے تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ سلام شامل ہیں [illegible]

صفحات: 307، قیمت: 60/ روپے

انشا کا ترکی روزنامچہ

مصنف: انشاء اللہ خاں انشا

انشاء اللہ خاں انشا اپنے زمانے کے ممتاز شاعر اور کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ یہ روزنامچہ جو سعادت علی خاں کے دربار سے ان کی وابستگی کے دنوں کی یادگار ہے ترکی زبان میں لکھا گیا ہے جو "چغتائیہ" کے نام سے موسوم ہے۔ ڈاکٹر نعیم الدین نے یہ ترجمہ براہ راست ترکی زبان سے کیا ہے اور مقدمے میں اس کی لسانی خصوصیات اور اس کے مندرجات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

صفحات: 68، قیمت: 4.50/ روپے

اردو کی نثری داستانیں

مصنف: گیان چند جین

اردو میں جو نثری داستانیں قلمبند کی گئی ہیں ان کی تعداد سینکڑوں سے تجاوز کر جاتی ہے۔ پروفیسر گیان چند جین کی یہ کتاب تمام دستیاب نثری داستانوں کا تعارف بھی ہے اور ان پر تنقیدی محاکمہ بھی۔ مختلف داستانوں کے فنی مدارج اور اس فن کے عہد بہ عہد ارتقا پر بھی عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

صفحات: 908، قیمت: 278/ روپے

اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب

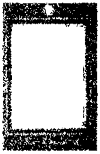

مصنف: گوپی چند نارنگ

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ادبی اور علمی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہے [illegible]

صفحات: 463، قیمت: 250/ روپے

اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)

مصنف: حنیف کیفی

[illegible]

صفحات: 608، قیمت: 182/ روپے

انتخاب کلام حسرت

مرتب: فضل امام

بیسویں صدی میں اردو غزل کے احیا میں جن شعرا نے اہم کردار ادا کیا ان میں سید فضل الحسن حسرت موہانی کو امام المتغزلین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں حسرت کے غزلیہ کلام کا ایک جامع انتخاب پیش کیا گیا ہے اور شروع میں ان کے شاعرانہ امتیازات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 91، قیمت: 9/ روپے

اردو کے ابتدائی ادبی معرکے (ابتدا سے عہد مرزا و میر تک)

مصنف: محمد یعقوب عامر

[illegible]

صفحات: 251، قیمت: 22/ روپے

کرڑی کہانی

[illegible]

قیمت: (پورا سیٹ) 280/ روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020. and published at NCPUL, West Block-1, Wing-8, R.K. Puram, New Delhi-110 066, Editor Dr. M. Hamidullah Bhat. Tel., 26103381, 26103938.